Course Title: BA (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy (SEP) 2024-25 and on waeds

Third Semester

Course Content: Khake , Qasida , Marsiya , Grammar and Interview

Course Credits	Total Contact Hours	Summative Assessment
3	4/week	Marks =80
		Farmative Assessment Marks = 20

UNIT : 1

خاکے

۱) نام دیو مالی	مولوی عبدالحق
۲) حضرت عائشہ بنت ابوبکر	پروفیسر بی شیخ علی
۳) مشتاق احمد یوسفی	مجتبیٰ حسین
۴) ڈاکٹر سر محمد اقبال	رشید احمد صدیقی

UNIT : 2

قصیدہ اور مرثیہ

۱) شہر آشوب	محمد رفیع سوداؔ
۲) ساون میں دیا، پھر یہ شوال دکھائی	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ
۳) قید خانے کی رات	میر انیسؔ

UNIT : 3

گرامر

UNIT : 4

انٹرویو (مصاحبہ نگاری)

علی سردار جعفری ڈاکٹر راہی معصوم رضا

مولوی عبدالحق

نام دیو- مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالؔی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا، ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کے ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ جھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صبح شام روز آنہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ ''دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور بادلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہوگئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آب حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے، اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔

ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اوپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اس کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا کہ میں نے جو تجھ میں استعداد و دیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

پروفیسر بی شیخ علی

ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ بنت ابوبکر صدیق

فیضان سماوی سے جب لطف وکرم کی شورش ہوتی ہے تو ایسی ہستیاں وجود میں آتی ہیں جن پر انسانیت تا قیامت ناز کرسکتی ہے۔ ایسی ہی ہستیوں میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ کا شمار ہے۔ وہ محسنہ امت تھیں۔ رشد وہدایت، علم وفضل، خیر وبرکت کا ایک عظیم مرکز تھیں۔ حافظ قرآن تھیں۔ تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور آداب وانساب میں ماہر تھیں۔ صرف آپ اکیلی احکام شریعت کے ایک چوتھائی حصہ کا سرچشمہ تھیں۔ آپ کی علمی فوقیت کا یہ عالم تھا کہ حج کے ایام میں آپ کا خیمہ کوہ حرا کے قریب نصب کیا جاتا تھا تا کہ وہاں حلقۂ درس قائم ہو، اور لوگ ان سے مسائل پوچھیں۔ فیاضی میں بے مثال تھیں وہ فراخ دلی کہ جب حضرت عمرؓ نے روضہ مبارک میں دفن کے لئے وہ جگہ مانگی جو آپ نے خود اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی تو بلا تامل آپ نے اپنا حق انہیں دے دیا۔ آپ نے اپنا مکان حضرت معاویہ کے ہاتھ فروخت کر کے اس کی ساری رقم راہ حق میں تقسیم کر دی۔ اخلاقی جرأت وہمت وحوصلہ میں یکتا تھیں۔ غزوہ احد میں شریک تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کیں۔ جنگ جمل میں شریک تھیں۔ حق گو ایسی کہ حضرت معاویہؓ آپ کی ناراضگی کی تاب نہ لاسکتے تھے۔ فصیح وبلیغ وتیز فہم خطیب تھیں۔ علمی کمالات، دینی خدمات اور حضورؐ کی تعلیمات وارشادات کے نشر واشاعت میں بے نظیر تھیں۔ آپ کی ذات سے کئی فضائل مخصوص ہیں۔ حضورؐ کو آپ بے حد محبوب تھیں۔ صرف آپ کنوار پن میں حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ باقی سب امہات المومنین بیوہ تھیں۔ اللہ تعالی نے آپ کے لئے آیت برات نازل فرمائی۔ آپ کی وجہ آیت تیمّم نازل ہوئی اور ام المومنین حضرت خدیجہ سے پرورش پائی تھیں۔ صرف آپ سے سب سے زیادہ احادیث ۲۲۱۰/ مروی ہیں۔ آپ سب سے زیادہ عالم، فقیہ اور سخی تھیں۔ نزول وحی کے وقت حضورؐ کے پاس صرف آپ ہوتی تھیں۔ آپ کی گود میں حضورؐ کی روح اقدس پرواز کر گئی اور آپ کے حجرے کو رحمت العالمین کے روضۂ پاک گنبد خضرا کا شرف عطا ہوا۔ غرض ایسی پاک بابرکت ہستی بجا طور ہر ''محسنہ امت'' کہلائی جاسکتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی، عائشہ نام، صدیقہ اور حمیرہ لقب، ام عبداللہ کنیت، قریش کے خاندان بنو تیم سے تھیں۔ والدہ کا نام ام رومان بنت عامر تھا۔ وہ بھی جلیل القدر صحابہ تھیں۔ بعثت نبویؐ کے چار سال بعد پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے بے حد ذہین وہوشمند تھیں۔ بچپن میں گڑیوں سے کھیل رہی تھیں۔ ان میں ایک پر والا گھوڑا بھی تھا۔ حضورؐ نے فرمایا، گھوڑوں کے تو پر نہیں ہوتے۔ فوراً بول اٹھیں حضرت سلیمان کے گھوڑوں کے تو پر تھے۔ حضرت عائشہؓ کی نکاح کی بشارت حضور کو خواب میں ہو چکی تھی۔ آپ کا نکاح انتہائی سادگی سے ہوا۔ وہ فرماتی ہیں ''جب رسول اللہ نے مجھ سے نکاح فرمایا تو میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ مجھے اس نکاح کا حال تک معلوم نہ ہوا۔ تا آنکہ میری والدہ نے مجھے گھر سے باہر نکلنے نہ دیا'' شوال میں نکاح ہوا تھا۔ زمانہ قدیم میں شوال میں سخت طاعون آیا تھا۔ اس

لئے اہل عرب اس مہینے کو منحوس سمجھتے تھے۔اس مکروہ خیال کو مٹانے کے لئے شوال کا مہینہ منتخب کیا گیا۔رخصتی ہجرت کے تین سال بعد ہوئی اور وہ بھی شوال کے مہینے میں۔رخصتی کے وقت آپ کی عمر ایک روایت کے مطابق نو سال اور دوسری روایت کے مطابق بارہ سال کی تھی۔ غزوہ احد میں آپ موجود تھیں۔حضورؐ کے زخموں کو دھویا۔مشکیزے سے زخمیوں کو پانی پلایا۔غزوہ خندق میں بھی قلعہ سے باہر نکل کر نقشہ ؐ جنگ دیکھا کرتی تھیں۔صحیح بخاری میں ہے کے آپ راتوں کو اُٹھ کر قبرستان چلی جاتی تھیں۔یہ فطری طور پر نہایت دلیر اور نڈر تھیں۔آپ کی حیات پاک کے چار اہم واقعات ہیں۔افک،ایلا،تحریم،تخییر۔افک کا واقعہ غزوہ بنو مصطلق سے تعلق رکھتا ہے۔سفر میں آپ پڑاؤ سے دور نکل گئیں۔اپنی بہن اسماءؓ کے گلے کا ہار جو وہ مانگ کر لائی تھیں،کہیں گر گیا۔اس کو ڈھونڈ کر واپس پہنچنے تک قافلہ چل پڑا تھا۔آپ اکیلی پیچھے رہ گئیں۔چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔رات کا وقت تھا۔صبح ایک صحابی صفوان بن معطل آپ کو پہچان گئے،انہیں ساتھ لے کر دوپہر تک قافلے سے جا ملے۔مشہور منافق عبداللہ بن ابی نے تہمت کا طوفان باندھ دیا۔آپ کی عصمت پر حملہ کیا۔حضورؐ کو سخت تشویش ہوئی۔حضرت عائشہ بھی بدنامی کے صدمے سے بیمار ہوگئیں۔اس وقت غیرت الٰہی جوش میں آئی اور آیت برأت نازل ہوئی جس میں یہ کہا گیا کہ ''تم نے یہ سنا تو مومن مردوں اور عورتوں کی نسبت نیک گمان کیوں نہ کہا کہ یہ صریح تہمت ہے''۔(سورۂ نور) اس آیت کریمہ سے دشمنوں کے منہ سیاہ ہوگئے۔سادہ لوح مسلمانوں کی غلط فہمی دور ہوئی۔انہوں نے عاجزی سے اللہ اور اس کے رسولؐ سے معافی مانگی۔حضرت عائشہؓ کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔آپ نے فرمایا''میں صرف اپنے اللہ کی شکر گزار ہوں کسی کی ممنون نہیں۔''

دوسرا واقعہ تحریم کا ہے۔حضورؐ ایک دفعہ حضرت زینب بنت جحش کے ہاں کچھ زیادہ دیر تک رُکے رہے۔حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا۔ حضورؐ نے حضرت زینب کے ہاں شہد کھایا تھا۔حضرت عائشہؓ نے حضرت حفصہ سے کہا کہ جب حضورؐ ہمارے اور تمہارے گھر تشریف لائیں تو کہنا''یارسول اللہ کہیں آپ نے مغافیر کا شہد تو نہیں کھایا؟''۔مغافیر ایک پھول ہے جس میں کچھ بو ہوتی ہے اور وہ بو شہد میں آجاتی ہے۔ جب حضورؐ دونوں ازواج مطہرات کے ہاں تشریف لے گئے تو دونوں نے وہی سوال دھرایا اور آپ نے فرمایا زینب نے شہد پلایا ہے۔پھر حضرت زینبؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔حسبِ معمول جب شہد پیش کیا گیا تو حضورؐ نے فرمایا''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔میں آئندہ شہد نہیں کھاؤں گا''اس پر سورۂ تحریم کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی''اے نبی تم اپنی بیویوں کی رضامندی کے لئے جو چیز خدا نے حلال کی ہے اس کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہو۔''

تیسرا واقعہ ایلا کا ہے۔ازواج مطہرات کے لئے جو رقم دی جاتی تھی وہ ناکافی تھی۔وہ تنگدستی سے گزر اوقات کرتی تھیں۔جب مال غنیمت آنے لگا تو انہوں نے اضافہ کی خواہش کی۔حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹیوں کو سمجھا کر اس مطالبہ سے باز رکھا۔ لیکن ازواج اس مطالبہ پر قائم رہیں۔اسی زمانے میں حضور گھوڑے سے گر پڑے اور چوٹ آئی۔آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے حجرہ سے متصل بالاخانے پر قیام فرمایا اور عہد کیا کہ ایک مہینہ تک ازواج مطہرات سے نہ ملیں گے۔منافقوں نے افواہ پھیلا دی کہ حضورؐ نے بیویوں کو طلاق دے دی۔تمام صحابہ سخت رنجیدہ ہوئے۔جب حضرت عمر فاروقؓ نے حضورؐ سے اس بات کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا'' نہیں''۔حضرت عمرؓ نے یہ خوش خبری سب کو سنا دی اور ہر طرف مسرت کی لہر دوڑ گئی۔۲۹ رویں دن حضورؐ بالاخانے سے اتر کر پہلے حضرت

عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ آپؐ نے ایک مہینہ کا عہد فرمایا تھا اور آج انتیس دن ہوئے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ''مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے۔''

چوتھا واقعہ تخییر کا ہے۔ ایک دن حضورؐ نے حضرت عائشہ سے فرمایا ''میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ اس کا جواب اپنے والدین سے مشورہ کر کے دو تو بہتر ہوگا۔'' پھر آپ نے سورہ احزاب کی
آیات تلاوت فرمائیں جس میں کہا گیا ہے کہ اگر حضور کی بیویوں کو دنیوی زندگی پسند ہو تو انہیں کچھ دے کر بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ اگر وہ اللہ اور اس کا رسول اور آخرت کا گھر پسند کرتی ہوں تو انہیں اللہ کے ہاں بڑا اجر عظیم ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فوراً بول اٹھیں اس میں والدین سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور آخرت کا گھر اختیار کرتی ہوں۔ یہی جواب سبھی ازواج مطہرات نے دہرایا۔

حضرت عائشہؓ حضورؐ پر جان چھڑکتی تھیں اور حضور کو بھی بے حد محبوب تھیں۔ ایک دفعہ آپ رات کے وقت اٹھ کر کہیں تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہؓ نے جب حضورؐ کو موجود نہ پایا تو دیوانہ وار اندھیرے میں ٹٹولنے لگیں۔ آخر کار آپ کو ایک کونے میں سربسجود یاد الٰہی میں مشغول پایا تو انہیں اطمینان ہوا۔ ایک دفعہ سفر میں حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ صحابہ تلاش میں نکلے۔ نماز کا وقت آ گیا۔ دور دور تک پانی کہیں میسر نہ آ سکا۔ لوگوں نے بغیر وضو نماز پڑھی۔ واپس آ کر حضور سے ماجرا عرض کیا۔ اس وقت آیت تیمّم نازل ہوئی۔ سبھوں نے اس کو بڑی فضیلت سمجھا اور کہا ''ام المومنین خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ کو کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس سے خدا نے آپ کے نکلنے کا راستہ نہیں بتایا اور مسلمانوں کے لئے وہ ایک برکت بن گیا۔''

حضرت عائشہ کی ازدواجی زندگی صرف نو برس کی رہی۔ ۱۱ھ میں حضورؐ مرض میں مبتلا ہوئے صرف تیرہ دن علیل رہے۔ پانچ دن دیگر ازواج کے ہاں قیام فرمایا اور آٹھ دن حضرت عائشہ کے ہاں ۱۲/ ربیع الاول کو سرور کائنات ﷺ کی روح اطہر عالم قدس کو پرواز کر گئی۔ اس وقت حضورؐ کا سر مبارک حضرت عائشہؓ کی گود میں تھا۔ پھر انہیں کے حجرہ مبارک کو حضورؐ کی ابدی آرام گاہ کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ اس کے بعد مزید ۴۸ سال وہ بقیدہ حیات تھیں۔ اس تمام عرصہ میں سارے عالم اسلام کے لئے رشد و ہدایت، علم و فضل و خیر و برکت کا مخزن بنی رہیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہر قسم کے مسائل پوچھتے تھے۔ ہر مسئلہ کے متعلق آپ کو حضورؐ کے ارشادات یاد تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، اور علم الانسان میں ماہر تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں فتوی دیتی تھیں۔ اکابر صحابہ پر انہوں نے دقیق اعتراضات کئے ہیں۔ صحابہ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال آ جاتا تو اس کو حضرت عائشہ ہی حل کرتی تھیں ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر کسی سے نہیں سنی۔ شعرا کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے۔

حضرت عائشہؓ کے شاگردوں کی تعداد دوسو کے قریب تھی۔ آپ جو حدیثیں روایت کرتیں اکثر اس کا پس منظر اور اسباب و علل بھی بیان کر دیتیں۔ سب سے زیادہ احادیث آپ ہی سے مروی ہیں۔ حضور کی تعلیمات و ارشادات کی نشر و اشاعت آپ سے بڑھ کر کسی نے

نہیں کی۔ وہ کورانہ تقلید پسند نہ کرتیں۔ ہمیشہ حضورؐ کے اقوال وافعال کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتیں۔ آپ نے دوسرے صحابہ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ان میں سے کچھ روایات یہ ہیں۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا عورت، گھر اور گھوڑا یہ تین چیزیں نحس ہیں۔ حضرت عایشہؓ نے فرمایا ابو ہریرہ نے آدھی بات سنی۔ جب ابو ہریرہؓ آئے تو نبی کریمؐ پہلا فقرہ فرما چکے تھے۔ وہ یہ کہ ''یہودی کہتے ہیں نحوست تین چیزوں میں ہے عورت، گھر، اور گھوڑا۔ حضرت فاروقؓ سے ایک روایت سماع موتیٰ یعنی جو فوت ہو چکے وہ سنتے بھی ہیں یا نہیں کے متعلق ہے۔ حضرات عمرؓ نے یہ بات حضورؐ سے دریافت کی۔ حضورؐ نے فرمایا'' وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے''۔ جب حضرت عائشہؓ نے یہ روایت سنی تو فرمایا عمرؓ سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد نہیں تھا کیونکہ قرآن میں اس کے خلاف نص صریح موجود ہے۔ سواہ فاطر میں آیا ہے'' آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے، اور آپ نہیں سنانے والے ان کو جو قبروں میں ہیں''۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ'' مردے پر اہل خانہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ نے اس روایت کو رد کیا اور فرمایا حضور ایک یہودیہ کے جنازے پر گزرے۔ اس کے اقارب رو رہے تھے۔ حضور نے فرمایا'' لوگ رو رہے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے (یعنی وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہی ہے) اس کے بعد فرمایا قرآن مجید میں واضح ارشاد ہے'' کوئی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھاتا''۔ حضرت عائشہ بے حد فیاض، مہمان نواز اور غریب پرور تھیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک بار انہیں ایک لاکھ درہم دیئے۔ انہوں نے اسی وقت سب رقم محتاجوں میں بانٹ دی۔ ایسے ہی ایک اور مرتبہ آپ کے پاس ستر ہزار کی رقم آئی۔ وہ بھی کھڑے کھڑے ساری رقم راہ خدا میں دے دی۔ ایک دن روزے سے تھیں اور گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک سائل آیا۔ روٹی اس کو دے دی۔ شام میں کسی نے اتفاقاً بکری کا گوشت بھیج دیا۔ آپ نے لونڈی سے فرمایا۔ دیکھو اللہ نے روٹی سے بہتر چیز بھیج دی ہے۔ آپ اپنا زیادہ وقت یا تو عبادت میں گزارتیں یا لوگوں کو مسائل بتانے میں صرف کرتیں۔ آپ کو غیبت اور بدگوئی سے سخت نفرت تھی۔ دل میں حد درجہ خوف خدا تھا۔ عبادت الٰہی سے بے انتہا شغف تھا۔ تہجد کبھی نہ ناغہ کرتیں۔ حج کی شدت سے پابند تھیں۔ رمضان ۵۸ھ میں ۶۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ جب حضرت عمرؓ نے درخواست بھیجی کہ مجھے حضورؐ کے پہلوئے مبارک میں دفن ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں تو حضرت عائشہ نے فرمایا تھا'' یہ جگہ میں نے اپنی تدفین کے لئے رکھی تھی، لیکن عمرؓ کی خاطر آج میں اس سے دست بردار ہوتی ہوں''۔ یہ ان کی فیاضی و دریا دلی کی انتہا تھی۔ حضرت ابو ہریرہ نے حضرت عائشہ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اپنی بہن اسماء کے لڑکے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنا بیٹا تصور کیا اور حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اپنی کنیت ''ام عبداللہ'' رکھی تھی۔

غرض حضرت عائشہ صدیقہ کی زندگی ہمیں ایک اہم پیغام دیتی ہے۔ پہلا یہ کہ فہم وادراک مردوں کی اجارہ داری نہیں۔ یہ مالک کی دین ہے۔ جس کو چاہے وہ دے گا۔ جلیل القدر صحابہ بھی آپ سے مسائل کے حل طلب فرماتے تھے۔ دوسرا مرد ہو یا عورت فطری خوبیوں وخامیوں کا مرکب ہے۔ ہزار خوبیوں کے ساتھ ایک دو لغزشیں آپ میں تھیں۔ شہد کے معاملہ میں حضرت زینبؓ پر رشک کیا۔ حضرت صفیہ سے کہا کہ ہم رسول اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں یعنی تم کم تر ہو۔ حضورؐ تک شکایت پہنچی۔ قربان جائیں سرور کائناتؐ کے فہم وذکیٰ

پر، آپ نے حضرت صفیہؓ سے کہا تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے کیونکر معزز ہوسکتی ہو جبکہ میرے باپ ہارونؑ، میرے چچا موسیٰ اور میرے شوہر محمدؐ ہیں۔ یاد رہے کہ حضرت صفیہؓ یہودیہ تھیں۔ حضرت عائشہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ جمل میں بھی شریک رہیں۔ تیسرا پیغام یہ کہ وہ فوراً سنبھل گئیں۔ جنگ جمل کا انہیں خوب پچھتاوا رہا۔ آپ کو جب بھی یہ جنگ یاد آتی آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں اور فرمایا کرتیں ''کاش میں آج سے بیس برس پہلے معدوم ہو چکی ہوتی''۔ انسان اپنے تجربات سے سیکھے۔ جو دوڑتا ہے وہ گرتا ہے، جو گرتا ہے وہ سیکھتا ہے، جو سیکھتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ چوتھا پیغام اخلاقی و تہذیبی زندگی آسان نہیں۔ اس کے لئے ایثار و قربانی چاہئے۔ ایمان و یقین چاہئے، فیاضی و فراخ دلی چاہئے۔ فکر صحیح عمل صالح چاہئے۔ پانچواں پیغام اسلام کا جوہر قلندری سے آشکار ہوا، تونگری سے نہیں۔ چھٹا اور آخری زندگی نہ بھڑک اٹھنے کا نام ہے، نہ بجھ جانے کا۔ زندگی نام ہے سلگتے رہنے کا۔ حضرت عائشہ کی زندگی آخر لمحہ تک سلگتے آگ کی طرح ایمان کی گرمی سینوں میں اُجاگر کرتی رہی۔ علم و فضل کے چراغ روشن کرتی رہی۔ اسرار حیات کی آتش بھڑکاتی رہی۔

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرار حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکہ بود و نبود

مجتبیٰ حسین

مشتاق احمد یوسفی

صاحبو! ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ لندن میں ہمیں یہاں کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی کو بھی دیکھنا تھا، سو انہیں بھی دیکھ لیا۔ ہماری اور آپ ہی کی طرح کے آدمی ہیں اور کوئی خاص بات نہیں۔ ہم تو انہیں ٹرافلگار اسکوائر اور برٹش میوزم کو دیکھنے سے پہلے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہماری اس عجلت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی تحریروں سے ہم نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ یہ لندن کی سب سے قدیم عمارت ہیں۔ مگر جب انہیں دیکھ لیا تو احساس ہوا کہ بگ بین ان سے یقیناً پرانی ہے، بلکہ ان سے دو ایک ملاقاتوں میں تو خود ہم بھی ان سے پرانے لگے۔ جو لوگ مشتاق احمد یوسفی سے ملنے کے خواہش مند ہیں انہیں ہم آگاہ کئے دیتے ہیں کہ ان کے لکھے پر بالکل نہ جائیں۔ یہ ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کے قول و فعل پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ''زرگزشت''، ''خاکم بدہن''، ''چراغ تلے'' کو پڑھ کر ہم نے اپنے تئیں یہ سوچ رکھا تھا کہ یہ عمارت تو اب کھنڈر بن گئی ہوگی۔ سوچا تھا کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو ہم عموماً تاریخی عمارتوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں، یعنی ہاتھ لگائے بغیر دور سے دیکھ لیا۔ کچھ طرز تعمیر کی تعریف، کچھ بچے کچے آثار اور نقش و نگار کو دیکھ کر اصل عمارت کی عظمت کا نقشہ ذہن میں تازہ کر لیا۔ ایک فوٹو کھینچ لیا کوئی محافظ نہ دیکھ رہا ہو تو عمارت پر اپنا نام بھی کندہ کر دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بہت ہوا تو جاتے جاتے عمارت پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے یہ مصرع جڑ دیا؟

آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی

ان کی تحریروں میں ان کی انوکھی انوکھی بیماریوں کا حال پڑھ رکھا تھا بلکہ ہمیں تو یہ بھی گمان تھا کہ موصوف تصنیف و تالیف کا بیشتر کام اسپتال میں انجام دیتے ہیں۔ ان کی تقلید میں ایک بار ہم بھی بڑی کوشش اور جستجو کے بعد بیمار پڑ کر اسپتال گئے تھے کہ وہاں جا کر مزاح نگاری کریں گے۔ مزاح نگاری ہم سے نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے جبکہ ڈاکٹروں نے ہمیں مزاح نگاری کرنے سے منع کیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ڈاکٹروں کو ہماری صحت کی پرواہ تھی بلکہ اس لئے کہ ڈاکٹروں کو اصل میں ہمارے قارئین کی صحت کی زیادہ فکر تھی۔ ہم نے ڈاکٹروں کو بہتر سمجھایا کہ بھیا ہماری بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے، ورنہ ہم تو آپ کے اسپتال میں مزاح نگاری کرنے آئے ہیں۔ سنا ہے جو مزاح نگاری اسپتال میں ہوتی ہے وہ کہیں اور نہیں ہوتی۔ ہماری اس بات کو سن کر کچھ ڈاکٹروں نے ہمیں امراض دماغی کے اسپتال میں منتقل کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ جب ڈاکٹر ہمارے اصل مرض کو سمجھنے سے قاصر رہے تو مشتاق احمد یوسفی کی بھی مثال پیش کی کہ ہمارے حسابوں موصوف کا بیشتر ادب عالیہ اسپتال میں ہی پیدا ہوا ہے اور اندیشہ ہے آگے بھی وہیں پیدا ہوتا رہے گا۔ سو ہمیں بھی اسپتال میں صحت مند ادب اور غیر صحت مند بچے پیدا کرنے کی اجازت دیجئے، مگر مشکل یہ پیش آئی کہ مشتاق احمد یوسفی کے بعد اردو مزاح نگاری نے تو بہت ترقی کر لی لیکن علم طب نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ڈاکٹر لوگ ہمارے بات کا مطلب سمجھتے۔ لہٰذا طب کے ڈاکٹروں نے ہمیں اسپتال

سے اور ادب کے ڈاکٹروں نے ہمیں ادب سے ڈسچارج کر دیا۔ اس پس منظر کے ساتھ ہم مشتاق احمد یوسفی سے ملنے گئے تو ہم نے ان کی تحریروں کو کم اور ان کی بیماریوں کو زیادہ اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے بے لوث بہی خواہ ہونے کے ناطے دلّی سے چلتے وقت ایک طبیب حاذق سے ان کے بعض مطبوعہ بیماریوں کے علاج کے لئے کچھ غیر مطبوعہ نسخے بھی حاصل کئے تھے۔ ان نسخوں کو ہم نے کسی مشکل سے حاصل کیا تھا اس کا حال آپ کو بتائیں۔ ہم نے حکیم صاحب مذکور کو یوسفی کی کتابیں دے کر کہا تھا کہ ان کی کتابوں میں مندرجہ بیماریوں کا حال احوال آپ پڑھیں، مرض کی تشخیص کریں اور کچھ نسخے، جو بقول آپ کے تیر بہدف ہوتے ہیں، تجویز کریں۔ ہم لندن جا رہے ہیں تو یوسفی صاحب کو دے آئیں گے۔ کہ اردو ادب اور مشتاق احمد یوسفی دونوں کا بھلا ہو۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے پاس ہم جب بھی مشتاق احمد یوسفی کے لئے موعودہ نسخے حاصل کرنے کے لئے گئے تو موصوف کا حال ہی جداگانہ تھا۔ بات کم کرتے تھے اور ہنستے زیادہ تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ''مجھے برسوں سے قبض کی شکایت تھی چراغ تلے کو پڑھنے کے ساتھ جاتی رہی'' ہم نے جی ہی جی میں کہا۔ چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔ دوسری بار گئے تو ان کی ہنسی کا والیوم کچھ زیادہ ہی بڑھا ہوا تھا۔ ہم نے موعودہ نسخہ مانگا تو ٹھٹھا مار کر بولے'' ابھی تو یوسفی کی بیماریوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ ماشاءاللہ خاصی دلچسپ شگفتہ اور صحت مند بیماریاں ہیں۔ ابھی تو تشخیص کی نوبت نہیں آئی۔ تمہیں تو ابھی بہت دنوں بعد لندن جانا ہے۔ اطمنان سے نسخے لے لینا اور ہاں خاکم بدہن میں نے پڑھ لی ہے۔ بڑی مفرح کتاب ہے۔ برسوں سے بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا وہ خاکم بدہن کے استعمال سے معتدل ہو گیا'' ہم نے کہا؛ بھلے ہی اپنا نسخہ نہ دیجئے خاکم بدہن کا نسخہ تو واپس فرما دیجئے۔

بولے ''ایک مریض کو ناشتے سے پہلے پڑھنے کو دیا ہے''۔

''اور چراغ تلے کا نسخہ'' ہم نے پوچھا۔

بولے ''ایک اور مریض کو رات میں دودھ پینے کے بعد اور سونے سے پہلے پڑھنے کے لئے دیا ہے۔''

ہم تیسری مرتبہ پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تازہ تازہ غسل سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ چہرے پر بشاشت، شرارت اور حرارت تینوں کے ملے جلے آثار نمایاں تھے۔ ہم نے تاڑ لیا کہ موصوف یوسفی ''زرگزشت'' اور اپنی ''زن گذشت'' دونوں کو ٹھکانے لگا کے بیٹھے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اپنے مطب کے گوشے میں لے گئے اور رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ ''بھیا! تمہارے پاس یوسفی کی اور کتنی کتابیں ہیں، سبحان اللہ! کیا مقوی کتابیں ہیں۔'' پھر آنکھ مار کر بولے۔ ''پہلے تو میں اپنے طور پر ان کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا اب تمہاری بھابی کے حکم کی تعمیل میں پڑھ رہا ہوں۔ بخدا کوئی ان کتابوں کو ڈھنگ سے پڑھ لے تو ''اشتہاری بیماریوں'' سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جائے۔ میاں! لندن میں اگر یوسفی سے واقعی تمہاری ملاقات ہو تو یہ ضرور پوچھتے آنا کہ انہوں نے اپنی رائج الوقت بیماریوں کو کب، کہاں اور کیسے حاصل کیا تھا۔ میں بھی ان بیماریوں میں مبتلا ہونا چاہتا ہوں۔ بیماریوں کے ملنے کا پتہ ضرور لیتے آنا۔ بھولنا مت۔ میں نے کئی اور مریضوں کو بہ رضا و رغبت ان بیماریوں میں مبتلا ہونے کے لئے آمادہ کر رکھا ہے۔''

غرض مشتاق احمد یوسفی سے ملنے سے پہلے ان کے تعلق سے ہمارا ذہنی پس منظر یہ تھا۔ لندن پہنچتے ہی افتخار عارف سے کہا ''بھیا بھلے

ہی ہمارے اعزاز میں اردو مرکز کا جلسہ نہ کرواؤ، جلسوں سے ہم یوں بھی دور بھاگتے ہیں مگر، مشتاق احمد یوسفی سے ہماری ملاقات تو کراؤ ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں اور موقع ملے تو مزاج پرسی بھی کرنا چاہتے ہیں۔''

افتخار عارف نے کہا، ''سو تو ہو جائے گی۔ فکر نہ کرو۔''

ہم نے پوچھا ''ان دنوں یوسفی صاحب کہاں قیام کرتے ہیں۔ گھر پر رہتے ہیں یا حسب دستور ہسپتال میں داخل ہیں۔''

افتخار عارف بولے ''نہیں بھیا اس وقت تو اپنے دفتر میں فرائض منصبی سے عہدہ برا ہو رہے ہوں گے۔ کہو تو فون پر ابھی تمہاری بات کرائے دیتے ہیں۔''

ہم نے افتخار عارف کو ٹوکتے ہوئے کہا ''یار تاریخی عمارتوں سے اس طرح فون پر بات نہیں کرتے۔ ہم خود انہیں دیکھنے چلیں گے۔ تم ان سے ملاقات کا وقت طے کر لینا۔

ہمیں لندن آئے ہوئے چوتھا دن تھا۔ پچھلی رات ساقی فاروقی کے ساتھ گذاری تھی۔ لہٰذا صبح میں جلدی بیدار ہونا قانوناً اور عملاً ممنوع تھا۔ ابھی ہم بستر ہی میں تھے کہ افتخار عارف کا فون آیا۔ ''یوسفی صاحب نے کل تمہیں اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے کل کی شام خالی رکھو۔''

ہم نے حیرت سے پوچھا، ''کیا یوسفی صاحب بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے؟''

افتخار عارف نے کہا ''جان من تم بھی عجیب بکری ہو۔ دعوت ان کے گھر پر ہو رہی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے تو کیا تمہیں اچھوتوں کی طرح الگ بٹھا کر کھلائیں گے۔''

ہم نے کہا، ''نہیں یار بات ایسی نہیں ہے۔ یوسفی صاحب غالباً پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے السروں کا حال ہم نے پڑھا ہے۔ خدانخواستہ ہماری وجہ سے بدپرہیزی ہو جائے اور وہ ہسپتال جا کر کہیں مزاح کی ایک اور کتاب نہ لکھ ڈالیں۔''

افتخار عارف نے کہا، ''تمہیں شاید نہیں معلوم کہ وہ بدپرہیزی سے پرہیز نہیں کرتے۔''

افتخار عارف کے فون کے بعد ہم بستر سے اٹھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ گھنٹی پھر بجی رسیور اٹھایا تو آواز آئی ''میں مشتاق احمد یوسفی بول رہا ہوں، کیا مجتبیٰ حسین تشریف رکھتے ہیں؟''

ہم نے اچانک اپنی آواز بدل کر کہا، ''جی ہاں تشریف رکھتے ہیں، مگر دوسرے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں، ابھی انہیں بلائے دیتے ہیں۔ آپ انتظار کریں''

ہم نے بستر سے اٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ سر کو زور سے جھٹکا، گلے کو صاف کیا، قمیص کے بٹن ٹھیک سے لگائے اور اپنی اصل آواز میں بولے ''السلام علیکم یوسفی صاحب، ہم تو آپ کی آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ لندن آئے چار دن ہو گئے مگر اب تک آپ کے دیدار نہ ہو سکے۔ آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔''

بولے، ''یہ اشتیاق ایک طرفہ نہیں دوطرفہ ہے۔ میں بھی آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں۔''

ہم نے کہا، ''آپ تو صرف مشتاق ہیں میں تو سراسر مشتاق احمد یوسفی ہوں''۔

آخر کو اپنے محبوب ادیب سے پہلی بار بات ہو رہی تھی، سو ہم نے ٹیلی فون بات چیت کو بھی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور لگے ان کی تحریروں کی تعریف کرنے۔ بولے، ''یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی اس وقت میں نے آپ کو یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ کل رات کا کھانا آپ ہمارے گھر کھائیں گے۔''

فون کا رسیور رکھنے کے بعد ہمیں 1962ء کی سردیوں کے وہ دن یاد آ گئے جب حیدر آباد میں مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' کا ایک نسخہ ایک حیدر آبادی خاتون کے پاس نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اس نسخے کے حصول کی خاطر ہر کوئی ان خاتون سے نہ صرف قریب بلکہ ''عنقریب'' ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے بھی موصوفہ سے قریب ہونا چاہا، مگر قریب ہونے والوں کی قطار اتنی لمبی تھی کہ مایوس ہو کر لوٹ آئے ''دروغ بر گردن راوی'' ایک مرحلہ پر موصوفہ کو یہ خوش فہمی بھی ہو گئی تھی کہ ان کے اطراف لوگوں کی یہ بھیڑ بھڑ کا ان کے حسن جہاں سوز کے سبب ہے۔ یہ سراسر ان کا حسن ظن نہیں حسن ظن تھا۔ ہم زندگی بھر دیکھنے والوں کی نظر دیکھنے والوں کا کاروبار کرتے رہے۔ لہٰذا موصوفہ کو زحمت دئے بغیر سلیمان اریب مرحوم سے کہ موصوفہ کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے اور یہ کہ ''چراغ تلے'' کا نسخہ ایک دن کے لئے ان کے قبضہ قدرت میں آ گیا تھا۔ ہم نے یہ نسخہ بالجبر حاصل کیا اور راتوں رات اپنے ٹائپسٹ سے اس کی تین کاپیاں ٹائپ کروالیں۔ ہم نے مشتاق احمد یوسفی کی ''چراغ تلے'' کو اسی ٹائپ شدہ حالت میں پڑھا تھا۔ ٹائپ کی بے شمار غلطیوں کے باوجود ہمیں یہ کتاب بے حد پسند آئی تھی۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ ہم نے یوسفی کے تئیں اپنی عقیدت کے جوش میں یہ بھی لکھ دیا کہ ''یوسفی کو پڑھ کر آپ پطرس اور رشید احمد صدیقی کو الگ الگ پڑھنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔'' ادب کے کچھ ڈاکٹروں کو یہ بات ناگوار گزری تھی، مگر ہم اب بھی اپنی رائے پر قائم ہیں۔ چنانچہ جب ہمارا جی رشید احمد صدیقی کو پڑھنے کو چاہتا ہے تو مشتاق احمد یوسفی کو پڑھ لیتے ہیں۔ پطرس کو پڑھنے کو جی مچلے تو مشتاق احمد یوسفی کو پڑھ لیتے ہیں۔ حد تو یہ کہ اگر کبھی مشتاق احمد یوسفی کو پڑھنے کو دل چاہے تو تب بھی مشتاق احمد یوسفی ہی کو پڑھ لیتے ہیں۔

غرض دوسری شام کو مرکزی لندن کے ایک خوبصورت فلیٹ میں ہم مشتاق احمد یوسفی سے ملے۔ ماشاءاللہ اتنے صحت مند نظر آئے کہ ان کی مزاج پرسی کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ سجا سجایا خوبصورت، وسیع اور کشادہ فلیٹ ہے۔ "زرگزشت" والے مشتاق احمد یوسفی جو اینڈرسن کے حضور میں جاتے ہوئے اپنی پتلون کے پیوند کو فائل سے ڈھک لیتے تھے۔ ''چراغ تلے'' والے مشتاق احمد یوسفی جن کی عینک لگا کر بچے اندھے بھینسے کا کھیل کھیلا کرتے تھے اور خان سیف الملوک کی سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر جانے والے مشتاق احمد یوسفی ہمیں اس فلیٹ میں نہیں ملے۔ ''زرگزشت'' میں ان کے حالاتِ زندگی اچھے نہیں تھے۔ اب حالت زندگی اچھی ہے۔ اصل اہمیت حالات کی نہیں حالت کی ہوتی ہے۔ بہت تپاک سے ملے مرنجان مرنج کم آمیز، کم گو اور اپنے آپ میں سمائے ہوئے۔ اس رات ان کی کم گوئی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی رہی ہو کہ محترمہ ماہ طلعت عابدی اور افتخار عارف کی نوک جھونک کچھ اس زور و شور سے جاری تھی کہ اچھا خاصا زود گو آدمی بھی خود بخود کم گو بن جائے۔ یوں بھی یوسفی اپنی کم آمیزی اور گوشہ نشینی کے لئے خاصے بدنام ہیں۔ گوشہ نشینی کا یہ عالم ہے کہ رسالوں میں اپنی تصویر

تک نہیں چھپواتے کہ کہیں کسی نامحرم کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ سال میں ایک بار کسی ادبی محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے شرکت کرنے کا اپنا یہ محدود کوٹہ ختم کر چکے تھے۔ ہم نے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اس سال اکتوبر یا نومبر میں ہندوستان آنے کا وعدہ ہم سے کر چکے ہیں مگر شرط وہی ہے کہ جلسہ ایک ہی ہوگا۔ دوسرا جلسہ کروانا ہو تو اگلے سال پھر ہندوستان بلوائیے۔ ہم نے ان کی شرط مان لی ہے اور وعدہ کر لیا ہے کہ ان کا ایک جلسہ حیدر آباد میں ہوگا، البتہ دوسرے شہروں میں صرف جلوس نکلیں گے۔ ہم نے اتنا قانون تو پڑھا ہی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کر سکیں۔ ہم نے ان سے یہ وعدہ افتخار عارف، نقی تنویر، رضا حسن عابدی اور ڈاکٹر ضیاالدین شکیب کی موجودگی میں لیا ہے۔ آپ کو بھی گواہوں میں شامل کر لیتے ہیں۔

ہم نے یوسفی سے کہا کہ ''زرگزشت'' کے بعد آپ کی کوئی تصنیف نہیں آئی۔ اب تو آپ کے حالات زندگی ''زرگزشت'' سے آگے نکل گئے ہیں۔ لہٰذا اب ''زرگزشت'' بھی آگے بڑھنا چاہئے۔ بولے ''میری ایک کتاب آ رہی ہے، مگر کب آئے گی میں خود نہیں جانتا۔ سنا ہے کہ کتابت ہو رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن چھپ کر آ جائے گی۔'' یوسفی جس اہتمام سے لکھتے ہیں اور جس اہتمام سے اپنی کتابیں چھپواتے ہیں یہ انہی کا حصہ ہے۔

ہم سے بولے: ''آپ جس طرح لکھتے ہیں اور جتنا لکھتے ہیں یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

ہم نے کہا ''یوسفی صاحب سچ پوچھئے تو ہم جس طرح لکھتے ہیں اور جتنا لکھتے ہیں اس کے لئے ہمت کی نہیں بلکہ دیدہ دلیری اور سینہ زوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں لکھنا بالکل نہیں آتا مگر کیا کریں اپنے ملک میں مشہور جو ہو گئے ہیں۔ لوگ زبردستی لکھواتے ہیں۔''

افتخار عارف نے کہا ''یوسفی صاحب! اپنے معیار کے معاملے میں اتنے سخت واقع ہوئے ہیں کہ ایک بار انہوں نے اپنا ایک مضمون رسالہ کو بغرض اشاعت روانہ کیا، رسالہ چھپ کر آ گیا تو یوسفی صاحب کو احساس ہوا کہ مضمون ان کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ لہٰذا بازار گئے۔ رسالہ کی ساری کاپیاں خریدیں اور انہیں خود اپنے ہاتھوں نظر آتش کر دیا۔''

ہم نے کہا ''یار افتخار یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، معیار کے معاملے میں ہمارا بھی یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جن رسالوں میں ہمارے مضامین چھپتے ہیں انہیں ہم خود نہیں جلاتے بلکہ ہمارے پڑھنے والے جلا دیتے ہیں۔ بات تو ایک ہی ہوئی۔''

معیار کی مماثلت سے ہٹ کر ایک اور معاملے میں بھی یوسفی ہم سے مشابہ نظر آئے۔ یعنی ہماری طرح ان میں بھی یہ اچھی عادت ہے کہ کسی کے خط کا جواب نہیں دیتے۔ سنا ہے کہ ایک محقق ان پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ صاحب یوسفی سے ان کے حالات زندگی مانگتے ہیں، یہ انہیں نہیں دیتے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اب ان صاحب نے یوسفی کو دھمکی دی ہے کہ اگر اندرون ایک ماہ وہ اپنے حالات انہیں روانہ نہ کریں گے تو وہ فلاں صاحب (جن کا نام ہم ظاہر کرنا نہیں چاہتے) کے حالات زندگی کو یوسفی سے منسوب کر دیں گے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

یوسفی سے اس رات بہت سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے پوچھا! ''یوسفی صاحب! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں فوجی مزاح

نگاروں کی بہتات ہے۔ ہر فوجی بندوق اٹھائے سنگین تانے، مزاح کے میدان میں گھس آتا ہے اور مورچہ سنبھال لیتا ہے۔ کرنل شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، میجر صدیق سالک اور میجر ضمیر جعفری کتنے نام گنائیں۔ ہمیں تو آپ کے اور مشفق خواجہ کے سوائے کوئی سویلین مزاح نگار نظر نہیں آتا۔

مشتاق احمد یوسفی نے ہمارے اس سوال کے جواب میں کہا چلئے کھانا لگ گیا کہیں ٹھنڈا نہ ہو جائے۔''

اسی طرح کا ایک اور سوال پوچھا تو بولے'' چلئے آئس کریم لگ گئی ہے کہیں گرم نہ ہو جائے۔'' غرض ایسی ہی دلچسپ دلچسپ اور شگفتہ شگفتہ باتیں ہوتی رہیں۔

جب مغرب میں مزاح نگاری کا ذکر آیا تو بولے'' جارج میکاش کا کہنا ہے کہ مغرب میں مزاح کب کا مر چکا ہے اور میں اس کی رائے سے متفق ہوں۔''

ہم نے کہا'' یوسفی صاحب سچ تو یہ ہے کہ مشرق میں بھی مزاح مر رہا ہے لیکن آپ اسے مرنے نہیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے کئی مزاح نگار اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مارنا چاہتے ہیں۔'' ہمارے اس تبصرے پر بولے۔'' لیجئے چائے آ گئی ہے چائے پیجئے۔''

صاحبو! تو یہ احوال ہے مشتاق احمد یوسفی سے ہماری ملاقات کا۔ اب آگے سن کر کیا کیجئے گا۔ باقی ملاقات بھی ایسی ہی ہوئی۔ تاہم اس ملاقات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے اتنا اور عرض کرتے چلیں کہ جب ہم جانے لگے تو یوسفی دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ ہمارا اوورکوٹ ہینگر سے اتارا اور ہمیں پہنانے لگے۔ ہم نے نہ نہ کی مگر نہ مانے۔ نتیجے میں ہمارا ہاتھ ان کے ٹیلی فون کے رسیور سے ٹکرایا جو دیوار سے لٹک رہا تھا۔ رسیور نیچے گرا تو ہم نے معذرت کی۔ بولے'' ارے نہیں! اس میں معذرت کی کیا بات ہے۔''

ہم نے جو بات یوسفی کو نہیں بتائی وہ اب آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر ان کے ٹیلی فون کے رسیور کو گرایا تھا تاکہ وہ اس بہانے ہمیں یاد رکھ سکیں اور ہمیں یاد رکھنے کی ان کے پاس کوئی معقول وجہ بھی تو نہ رہ جاتی۔ ان کے گھر سے باہر نکل آئے تو لندن کی سڑکوں پر بوندا باندی ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی دھند پھیل رہی تھی۔ ہمیں نہ جانے کیوں اصغر گونڈوی کا ایک گمنام شعر یاد آ گیا جسے ہم نے زمانہ طالب علمی میں پڑھا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا

اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر سر محمد اقبال

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے، بہت تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے فلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی؛ ''آسیائے گردش ایام'' ایک آن کے لیے رک سی گئی لیکن فوراً ہی پھر رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کو جی ہوا، ہر چیز ہر شخص اجنبی سا معلوم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیے طفلی کا زمانہ یاد آیا، جب اقبال کے اشعار چھٹ اپنے کسی دوستی کی طرح مزے دار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور اقبال کے بارے میں یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں ان ہی میں رہتے بستے ہیں، اقبال کی صورت وہی ہو گی جو میرے اپنے تصورات میں بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی، جادوگروں جیسی کچھ عجیب سی!

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اب بھی جبکہ ادراک و شعور ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے، اچھے شعر کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے معلوم نہیں کیا چیز تصورات کو کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔ وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ پڑھانے کو پر لطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالبؔ نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثیرات پر ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں محسوس ہوا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفی بھی۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، لاہور مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا، کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے

تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھتے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوتے، گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں مردانہ انداز آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھرّیاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت ومحبت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لیے رہے، بھاری بھرکم لہجے میں بولے، آپ ہیں جی، صدیقی صاحب میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول، اور حلیہ دیکھ کر متحیر اور مرحوم کے انداز تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر متعجب، اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ ق کا تلفظ سن کر پھر پریشان سا ہوا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا، لیکن ذہن میں معلوم نہیں، کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوری سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا، مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور نا قابل بیان مروت ومرحمت تھی کہ سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوئے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا، جس کا میں مستحق ضرور تھا، گو منتظر نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے، آواز بھاری تھی اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی ومتوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے۔ مرحوم کی باتیں سنئے، بشرط یہ کہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتیں۔ وہ صرف الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسا کرتے تھے۔ بلکہ وہ باتیں کہیں دور سے اور بڑی گہرائی سے آئی تھیں۔ گفتگو حشو وزوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی اور بحث اتنی واضح اور جامع ہوتی کہ وضاحت وجامعیت بجائے صنائع وبدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر گرمی و روشنی کے آثار نظر آنے لگتے۔

شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت ایک نوجوان شاعر آ گئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے، ان کی شاعری اور لہجہ پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ نوجوان کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی، ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزاری میں تبدیل ہونے لگی۔ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے، صحبت ختم ہوگئی۔ صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے، اندر سے دیر میں برآمد ہوئے چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حقہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے، اس کے بعد فرمایا، نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے۔ اب طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ ہر ایک سے پرسش حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اچھا ہے یا برا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مخصوص دُکھ سکھ سنتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص ان کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بے تکلفی سے اپنی سناتا۔

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا۔ اس لیے اطمینان اور شفقت کے ساتھ باتیں شروع کیں۔ اس زمانے میں مرحوم کے نظریۂ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس لیے ان پر خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بڑے عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جو اُن کی سیرت کا بڑا گراں قدر پہلو تھا، اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ اس وقت جو چیز سب سے عجیب اور اچھی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم کس خوبی سے واضح کر دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے مسلہ میں پیچیدگی تھی ہی نہیں۔ عالمان و مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ بہت پیچیدگیوں اور غیر متوقع مسائل کا حل آسانی سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجۂ فوق البشر، بعثت نبوی کا وقت اور مقام، فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے۔ میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گذشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے۔ لیکن ایک بات جس کا ذکر بار بار کروں گا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں غلطی ہے۔ مرحوم کی فکر و نظر کا کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دوران گفتگو میں ان پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہوگئی ہوں۔

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے، مسودہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا۔ فرمایا ان مسائل پر بعض مستند علما سے تبادلہ خیالات کرنا چاہتا ہوں، کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سودمند ہوگا۔ عرض کیا کہ اس کوچہ سے نابلد ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیش تر علما، علم دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہیں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کیے ہوتے ہیں، اس لیے ان پر ہمارے علمائے کرام صحیح رائے قائم کرنے سے معذور ہیں۔ تو کچھ تعجب نہیں۔ جب تک مسئلہ کی اہمیت و مصلحت نہ معلوم ہو، اس وقت تک ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جا سکتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب، سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں یا کریں گے۔ اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارے میں مرحوم نے بڑے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔

مرحوم کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا۔ ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ فلسفی، مفکر اور متدین ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبیر کو دخل ہوتا۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون شناس اور اچھی وکالت کرنے والے کا واضح ربط ہوتا۔

ان کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبر، حکیم یا فلسفی کی

بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا اور اس کو مناسب وموزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبالؔ کی شاعری، شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبالؔ کا آرٹ اور اعتقاد دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبالؔ کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اقبالؔ نے ملکات فطری کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت بخشی۔ شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر کا طبعاً مفکر ہونا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً یہی توفیق الٰہی انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہے بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوز عظیم پر فائز کرتی ہے۔

علی گڑھ میں ایک دن، دوستوں کی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر ؎

صد باد صبا ایں جا بے سلسلہ می رقصد   این است حریف اے دل تا باد یہ پیمائی

پر گفتگو ہونے لگی۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر ایک نے موشگافیاں کیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبالؔ سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ مرحوم سے استصواب رائے کیا گیا۔ فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔ ہر رائے پر محاکمہ کیا اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول مدنظر رکھ کر پیش کرے۔ اس لیے شعر کے مطالب جداگانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ متضاد نہ ہوں۔ آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا پورے طور پر خود استبصار نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنا اطمینان کر لے۔ آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان رموز سے اپنا لے جو اس کے شعر میں دھوپ چھانو کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، بلکہ کچھ اور ہوتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان ہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ایک دن صبح غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ اس روز خاص طور پر بڑی تکلیف تھی، مشکل سے باہر آیا۔ بڑے افسردہ لہجے میں رک رک کر عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب کاش اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ہائے ان کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا، مایوس کیوں ہوتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے۔

اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب

جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھارے کاش کسی وقت حاضر خدمت ہو کر اُن کے لیے وہ کر سکتا جو انھوں نے میرے لیے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں مرحوم بہت بڑے آدمی تھے، ان کو مجھ جیسا معمولی شخص مرحوم کو کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا۔ وہ خاصان بارگاہ سے تھے۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ گو معجزے کا زمانہ نہیں رہا، لیکن محبت وخلوص میں اب بھی بڑی کراماتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کون سی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے زائل نہیں کر سکتے!

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کا توسل دربار بھوپال سے ہو گیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر سید راس مسعود مرحوم کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اقبالؔ کو جن دقتوں کا سامنا تھا اب اس سے نجات ہو گئی تھی، دور آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نام کے صلے میں بھوپال کی نجاتِ اخردی متیقن ہے۔ اقبالؔ کو غم روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبالؔ سے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خان بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو آن عزیز وگرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شکسپیر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا گوارا نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی۔ اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت وآرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کر دیا تھا، جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے، یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچے پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغانِ حجاز میں دخترانِ ملت کو یوں مخاطب کیا ہے ؎

زشامِ ما بروں آور سحر را　　بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرآت تو　　دگرگوں گرد تقدیرِ عمر را!

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لیے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی خیال رکھتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوتے ہیں، لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا، قرآن کیا سنیں گی، وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے، فرمایا صبر، علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے!

اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ ان کی فکر وفرزانگی، شاعر وشخصیت اور ان کا مجموعہ، ان کی مادرائی بصیرت کا ترجمان ہے۔ یہ وہ

مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں منفرد وممتاز ہو جاتے ہیں اور ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

یہاں ایک واقعہ مولانا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کروں گا۔ مرحوم تحریک خلافت کے سلسلے میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے سوال کیا، اور کیوں جناب، راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں، فرمایا کیوں نہیں، پوچھا معاف فرمائیے گا، کیا دریافت کر سکتا ہوں کس کس قسم کی اور کون سی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کے لیے سراپا اشتیاق بن گئے، مرحوم نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ایک تو کلام پاک ہے، اور دوسرا، دیوان داغ!

اسے ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھ لیا جائے، تب بھی اس سے مولانا کی پُر تجمل شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ یہاں کسی طویل نفسیاتی تذکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز و پرداخت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کے پہلے بچے کی شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا:

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود

آہ! زاں غنچہ کہ باد سحر او را نہ کشود!

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے ڈاکٹر صاحب بڑے مسرور تھے اور اس کے دیکھنے کے بے حد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دیے بغیر بھوپال آ گئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور سر اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر راس نے فرط اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش میں لینا چاہا، اقبال نے آواز دی، نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر غور کرے گی یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانے میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوش مادر سے سب سے پہلے براہ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے لڑکے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لیے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی، بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ چکی تھیں۔ مرحوم کے دریافت کرنے پر میں نے ہی تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلے میں کچھ عرصہ تک خط کتابت ہوتی رہی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکرمند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا۔ لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر

میں نے کسی قدر تھک کر لکھ دیا کہ آپ کا نقطہ نظر سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے بہتر یہ ہوگا کہ امتحانا انھیں دو ایک ہفتہ کے لیے اپنے ہاں بلا لیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت، قابلیت، دیانت و امانت، محبت و مروت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسا ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے جاوید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا، ایک حد تک خاموش اور کم آمیز، کھل کر ملنے یا بات کرنے میں بھی تکلف کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے اور جاوید ان کے کلام میں کہاں کہاں اور کس طرح جاری و ساری تھا۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بانو! مشکل سے ۶-۷ سال کی عمر ہوگی، کیسی تندرست، چنچل، ذہین، خوب صورت بھولی بھالی بچی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حسبِ معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی، لیکن رہ رہ کر کسی الجھن میں مبتلا ہو جاتی، پوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپا جان، ابا موجود تھے تو یہ جان اور ستارے کتنے چمک دار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے!!

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں، اس کی ہم جولی اور اس کا کھلونا سب ہی کچھ تھے۔ اس سلسلے میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرے میں بانو تک کا آنا بند کر دیا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئی جہاں کوئی اور نہ تھا، میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کے سینے پر بیٹھی ہوئی بے تکلف باتیں کیے جا رہی ہے۔ میں گھبرا اٹھی، سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ میں نے دبے پانو قریب جا کر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا- سر اقبال بول بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوتی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لیے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ اس کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے ان پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبہ مسرت سے ایک لمحہ کے لیے اور روشن کیے ہوئے رکھنا چاہتے تھے!

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو گریہ گلو گیر ہو جاتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف

انسان نہ دیکھا۔ پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پورے یورپین کپڑے پہن کر آتے اور انھوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ پھر مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انھوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنیائن اور تہبند پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرے ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسا کرنے کا عجیب مادہ تھا۔ میری کسی تجویز کو انھوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے زیادہ کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اگر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا۔ شاہی مسجد کے بائیں سمت اس مردِ قلندر کو آسودہ خاک پایا۔ یقین نہ آیا کہ یہ اس اقبال کی آرام گاہ ہے ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے
اور آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

کچھ ایسا محسوس ہوا کہ بادشاہی مسجد کی پروقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات دماغ پر اس درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ بے اختیار دل یہ چاہنے لگا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیے جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نمایاں نہ ہو۔

مرحوم زندہ تھے تو اطمینان رہتا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ ان سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہوگی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انھیں سلجھا دیں گے۔ کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لیے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے۔ کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔

وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصویرات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اُٹھ جانے سے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب
نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ امید کہ اقبال جیسا رہبر ملے گا جو ان کی تشکیل و تزئین رہ میں مدد دے گا۔

مرحوم اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے میں ان کی اس بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہ راست نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ ان راستوں پر مجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ ہوں میرے لیے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

شہر آشوب

محمد رفیع سودا

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانوا ڈول　　پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں دو بول　　اگر کہوں میں تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیروں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند　　سو آمدان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند　　جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریٔ گول

پس ان کا ملک میں کارنسق جو یوں ہو تباہ　　کہ کوہ زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پرکاہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ　　کہاں سے آئیں پیارے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

جو کوئی ملنے کو ان کے انھوں کے گھر آیا　　ملے یہ اس سے گرا پنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں آیا　　انھوں نے پھیر کے ادھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بابا کچھ اور باتیں بول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ سے　　کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھوں تو دل ہوئے زندگی سے اداس　　بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں ڈہے مرغول

رکھے تھی سیر یہ پنگھٹ کے گرد کے دیہات　　کہ لب جہاں کے تھے پنہاریوں کے آب حیات
اور ان درختوں کے دے چھاؤں دے گھنے گھنے بات　　نہ وے درخت ہیں واں اب نہ آدمی کی ذات
کنوؤں میں مردے پڑے ہیں نہ ریسمان ہے نہ ڈول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم　　نہ جانے کن رکھایاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر ہے اس جگہ میں زقوم　　مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحر جہاں پہ ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی وہاں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس　　پرے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانوں کے مانوس
کڑوڑ دل پر از امید ہو گیا مایوس　　گھروں سے یوں نجبا کی نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں تھے جو صاحب چنڈول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر　　کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یوں لہر
جو ٹک ہے امن دل اپنے کو دیوے گردش دہر　　تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سوداؔ کہ آگے تاب نہیں　　وہ دل نہیں ہے کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں　　سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے بے طرح کا زیادہ نہ بول

---

(۱) قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر

ساون میں دیا، پھر یہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال، ابروے پرخم سے اشارہ
ساقی کو، کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلّوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ، نہ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی، تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے، آتش سے مئے تیز، اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے (۵)
ہووے نہ ممیّز، کُرّۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے یہ زور
ہر نالے کی ہے، دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزم عمّاں پہ لب جو، متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی، جو زمیں پائی

سردی حِنا پہنچے ہے، عاشق کے جگر تک
معشوق کا، گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے، کہ تاثیر ہوا سے (۱۰)
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرفِ ہوا ہے طرب و عیش کا عالم
ہے مدرسہ میں بھی، سبق صرف ہوائی

خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور
زاہد کا بھی، ہر دانہ، تسبیحِ رُیائی

جو آئینۂ دَل ہے، وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینائے مے کاہ رُبائی

کرتی ہے صبا آ کے، کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آ کے کبھی للہ خائی

تھا سوزنیٔ خار کا، صحرا میں جہاں فرش (۱۵)
سبزہ نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کے لئے، جامۂ رنگیں
زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے قوس قُزح وسمہ، تو خورشید
سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گل چیں کا ہے، سرخی سے یہ عالم
جوں وقتِ غضب، چہرۂ تُرکانِ خطائی

کیا ساغرِ رنگیں کو کیا یا جلد مہیا (۲۰)
نرگیس نے، تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

ہوتی متحمل نہیں، ایک ساغرِ گل کی
شاخِ گل احمر کی، نزاکت سے کلائی

اعجاز نواسنجیٔ مُطرِب سے، چمن میں
ہر شاخ کی ہے نوکِ زبان شعر نوائی

شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے، تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے، ابرو نے وہ تیری (۲۵)
کی آئینہ چرخ میں ہے عکس نمائی

پرتو سے ترے، جامِ مے عیش، سرِ بزم
لے ساغرِ جمشید کرے کار روائی

ٹپکے لبِ ساغر سے، وہ قطر کروی شکل
ہو مثل فلک، جس میں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا، سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہو سکے، کاسہ میں سمائی

پڑھتا ہوں تیرے سامنے وہ مطلعِ موزوں
احسنت، کہیں سن کے، بہائی و سنائی

(۳۰) یوں کرسی زر پر ہے، تیری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو، سرِ رحل طلائی

رکھتا ہے تو، وہ دستِ سخا، سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بہ کف از بہر گدائی

گمرہ کو ہدایت، جو تری راہ پہ لائے
رہزن بھی اگر ہو، تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخنِ تدبیر
دشمن کی ترے ہو، نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو، نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے، در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے، جوں یدِ بیضا (۳۵)
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تری نذر، سدا نقدِ سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے
گر سر بہ ہوا، ہووے ترا تیر ہوائی

ہر کوہ، اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں، جب تیرے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگ صنم میں
ہر بت میں کرے، صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعر غزل میں ترے، معنی شفا ہیں (۴۰)
قربان، غزل کے تری، دیوان شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی، شمع نے اُنگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہے، تیغ ہمیشہ
خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے، نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوقؔ کو مضمون ثنا میں
ہے ذہن رسا کو، یہ کہاں اُس کے رسائی

ہر سال، شہا! ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو، مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

مرثیہ

قید خانے کی رات

جب قیدیوں کو خانہ زنداں میں شب ہوئی　　بچوں کی مارے خوف کے حالت عجیب ہوئی
گھٹ گھٹ کے دخترِ شہ دیں جاں بلب ہوئی　　مضطر کمال بنت امیر عرب ہوئی
آفت کا سامنا تھا نئی واردات تھی
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات تھی

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ　　یہ رنگ تھا کہ ہووے خزاں دیدہ جیسے باغ
رونے سے اہل بیت کو اک دم نہ تھا فراغ　　نے چاندنی، نہ شمع، نہ مشعل نہ واں چراغ
غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

یوں وہ شکستہ حال تڑپتے تھے ہر نفس　　دشوار جیسے صید پہ ہو تنگئ قفس
جانوں کو تھی بدن سے نکل جانے کی ہوس　　بازو بندھے ہوئے تھے نہ تھا کچھ کسی کا بس
دل چھاتیوں میں صورتِ بسمل پھڑکتے تھے
زندان کے در سے جا کے سروں کو ٹپکتے تھے

اس گھر میں اہل بیت محمد ہوئے تھے بند　　جز کہنگی جسے نہ کسی نے کیا پسند
تنگی سے ایک ایک کو تکلیف تھی دو چند　　تھوڑی سی جا مگر کہیں پست اور کہیں بلند
وہ بیبیاں اسیر تھیں اس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

مولوی عبدالحق

زمانہ

زمانے تین ہیں۔ گزشتہ، جسے ماضی کہتے ہیں۔ موجودہ، جو حال کہلاتا ہے۔ آئندہ، جس کا نام مستقبل ہے۔ ہر فعل کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک زمانے میں واقع ہو، لیکن بلحاظِ معانی وتکوین فعل کی تین حالتیں ہوں گی۔

۱۔ کام جو ابھی شروع نہیں ہوا، یعنی مستقبل۔

۲۔ کام جو شروع تو ہوا لیکن ختم نہیں ہوا، یعنی افعال ناتمام۔

۳۔ کام جو ختم ہو چکا، یعنی افعال تمام۔

مستقبل

۱۔ مستقبل مطلق میں زمانۂ آئندہ کا علم تحقیقی ہوتا ہے، یا ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مضارع میں احتمالی یا شرطی ہوتا ہے اور امر میں امکانی۔

۲۔ تمہیں پھر ایسا آدمی نہیں ملے گا، جہاں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ یہ مثالیں ایسی ہیں جن میں تحقیقی اور یقینی طور پر ایک امر کا بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض اوقات صرف ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، گو حقیقت میں نہ ہو۔ مثلاً میں نے اگر وعدہ پورا نہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہ نہ آیا تو بڑی مشکل پڑے گی۔ تم امتحان میں کامیاب نہ ہوئے تو نوکری مشکل سے ملے گی۔

۳۔ بعض اوقات مصدر، ہونا، کا مستقبل مطلق، ہوگا، محاورے میں اس طرح مستعمل ہوتا ہے کہ وہ تمیز فعل کے معنی دیتا ہے مگر یہ ہمیشہ سوال کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے وہ مکان بہت قدیم معلوم ہوتا ہوگا؟ جس کے معنی 'شاید' یا 'غالباً' کے ہیں۔

فعل حال

(الف)۔ حال مطلق: اصل میں تو یہ فعل حالاتِ موجودہ کو ظاہر کرتا ہے یا کسی ایسے کام کو جو اس وقت ہو رہا ہے لیکن ضمناً زمانۂ حال کے متعلق دوسرے معنی پیدا ہوتے ہیں،

مثلاً:

۱۔ عادت یا تکرار فعل: جیسے، جب وہ آتا ہے یہی شکایت کرتا ہے۔ شام کے کھانے کے بعد وہ روزانہ باغ کی سیر کو جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی ہر جگہ ساتھ آتے اور جاتے ہیں

۲۔ عام امور صداقت جو کبھی باطل نہ ہوں گے یا جن کی نسبت ایسا خیال کیا جاتا ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو خلق اللہ کی خدمت کرتا ہے۔ خدا کے نزدیک بڑا وہی ہوتا۔ ہزار جتن کرو قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔

۳۔ مستقبل قریب بلکہ اقرب کے لئے۔ جیسے، میں ابھی جاتا ہوں۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ حال ناتمام بھی بعض اوقات ان معنوں

میں ہوآتا ہے۔جیسے، میں شہر جارہا ہوں۔

۴۔زمانۂ گزشتہ کے لئے جیسے حال حکائی کہتے ہیں۔جیسے، بابر ہندوستان پر حملہ کرتا اور افغانوں اور راجپتوں کو شکست دیتا ہے ۔مولانا روم فرماتے ہیں، جو اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بے چاری معصوم لڑکی زمین پر پڑی تڑپ رہی ہے۔

۵۔بعض اوقات ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو زمانہ گزشتہ میں شروع ہوا اور حال میں بھی جاری ہے۔جیسے، میں چند روز سے دیکھتا ہوں (یا دیکھ رہا ہوں) کہ یہ لوگ اپنا فرض پورے طور پر ادا نہیں کرتے۔

(ب) حال تمام۔جو اگرچہ بلحاظ زمانہ حال پورا ہو چکا ہے لیکن بعض اوقات سوائے اس کے اور معنی بھی دیتا ہے۔مثلاً

ا۔کبھی یہ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں فعل تمام نہیں ہوا اور چاہئے تھا کہ حال مطلق استعمال ہوتا، لیکن محاورے میں حال تمام ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔جیسے: تم کیسے بے فکر بیٹھے ہو۔

۲۔بعض اوقات ایسے موقع پر جہاں از روئے قیاس ماضی ناتمام ہونی چاہئے تھی۔مثلاً: یہ لوگ کسی زمانے میں بڑے نامور گزرے ہیں۔پچھلے زمانے میں یہ بھی اپنا نام کر گیا ہے۔

۳۔بجائے ماضی مطلق۔جیسے، مجھے کل ہی بادشاہ نے خلعت عطا فرمایا ہے۔

۴۔بجائے حال حکائی یا ماضی مطلق۔جیسے، حدیث میں آیا ہے۔خدا نے فرمایا ہے۔قرآن میں لکھا ہے۔

ماضی

(الف)۔ماضی مطلق: ایسے فعل کو ظاہر کرتی ہے جو زمانہ گزشتہ میں بلاتعین وقت ہوا، مگر علاوہ اس کے محاورے میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوتی ہے۔مثلاً:

ا۔بعض اوقات حال کے بجائے۔جیسے، آپ یہاں بہت دنوں تک رہے (یعنی بہت دنوں سے ہیں)، یا حال تمام کے بجائے۔ جیسے، آپ بہت دنوں تک بچے رہے (یعنی بہت دنوں سے بچے ہوئے ہیں)۔اب یہاں تنکا تک نہیں رہا۔(نہیں رہا ہے)۔

۲۔بجائے حال مطلق۔جیسے، اس شہر میں جو آپ سے نہ ملا کا آنا یہاں بیکار رہوا (یعنی جو آپ سے نہیں ملتا اس کا یہاں آنا بیکار رہوتا ہے)۔

۳۔بجائے مستقبل۔وہ آیا اور میں چلا (جس وقت وہ آئے گا میں چل دوں گا، یعنی اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا) یا بول چال میں نوکر کو آواز دیتے ہیں ''یہاں آؤ''۔وہ جواب دیتا ہے ''آیا'' یا اس سے کہتے ہیں ''پانی لاؤ،'' وہ کہتا ہے ''لایا''، ان میں مستقبل کے معنی ہیں۔

(ب) ماضی ناتمام جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص زمانہ گزشتہ میں کام جاری تھا۔اس کا اظہار مختلف صورتوں سے ہوتا ہے۔

(الف) وہ کالج میں پڑھتا تھا۔(ب) وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔(ج) وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا۔(د) وہ مدت تک کالج میں پڑھا کیا۔

صورت اول: فعل جاریہ بلاتعین و بہ تعین وقت ہے۔

صورت دوم: اس وقت استعمال ہوتی ہے جب ہم کسی وقت خاص یا مدت کا ذکر تے ہیں۔ مثلا: جب میں وہاں گیا تو وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔

صورت سوم: ایسی حالت میں استعمال ہوتی ہے جب کہ زیادہ مدت کا اظہار کرنا مقصود ہو، یا جب اس کے ساتھ دوسرے فقرے میں اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے۔ مثلاً: وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا مگر کچھ حاصل نہ کیا۔

صورت چہارم: صورت سوم کے مثل ہے یا بعض اوقات ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے جب کہ دو ایسے فعل متواتر جاری ہوں جن کا باہم تعلق ہے۔ میں کہا کیا اور وہ سنا کیا۔

صورتِ سوم میں بھی اس طرح استعمال ہوتی ہے۔ ماضی نا تمام سے بعض اوقات خاص زمانے میں فعل کا بہ تکرار واقع ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً: جہاں کہیں وہ پہنچے تھے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے۔

بعض اوقات فعل امدادی حذف بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے جہاں کہیں وہ جاتے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے۔

(ج) ماضی تمام: جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام کو ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے۔ جیسے، میں اس سے ملنے گیا تھا۔ کبھی ماضی تمام ایک فعل گزشتہ کے فعل ماقبل کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے، وہ اس وقت آیا جب کہ میں کھانا کھا چکا تھا۔

مولوی عبدالحق

حروف جار

حروف جار کو حروف ربط بھی کہتے ہیں۔ حرف ربط وہ ہیں جو ایک لفظ کا علاقہ کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ کا، کے، کی۔

۲۔ نے۔

۳۔ کو، تئیں، سے، میں، تک، پر۔

یہ حرف ربط سادہ قسم کے ہیں جو عموماً اسم یا ضمیر یا تمیز کے ساتھ آتے ہیں اور ان کی حالت کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً نمبر (۱) حالت اضافی کے لئے (۲) حالت فاعلی کے لئے (۳) حالت مفعولی ظرفی یا طوری کے لئے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں جو حروف ربط کا کام دیتے ہیں مثلاً پاس، تلے، پیچھے، آگے، بیچ، سمیت، اوپر، نیچے، باہر، لئے، ساتھ، سنگ، سامنے، مارے۔ مگر یہ تمام الفاظ بجز ''سمیت'' کے اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں، جیسے اس کے پاس، صندوق کے نیچے، دھوپ کے مارے۔ ان میں سے بعض کی اصل سنسکرت ہے۔

اسی طرح بہت سے فارسی و عربی کے الفاظ بھی حروف کا کام دیتے ہیں جیسے بغیر، اندر، نزدیک، باعث، واسطے، سبب، سوا، طرح نسبت، بجا، بجز موجب، پیش پیش، قبل، گرد، درمیان، یہ الفاظ بھی اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں۔

ہندی کے بعض حروف ربط دو دو مل کر آتے ہیں اور ایک حرف کا کام دیتے ہیں۔ جیسے وہ چھت پر سے گر پڑا، نالی میں سے نکل گیا، یہ تو اس میں کا ہے، دیوار پر سے گر گیا۔

حروف ربط (جار) مفصلۂ ذیل اسما کے بعد آتے ہیں۔

سے

(۱) اسم کے بعد۔ جیسے: احمد سے کہو۔ (۲) صفت کے بعد (جب بطور اسم مستعمل ہو)۔ جیسے: بد سے بچو، نیک سے ملو۔ (۳) ضمیر کے بعد: اس سے کہو۔ (۴) فعل کے بعد: اس کے سننے میں فرق ہے۔ (۵) تمیز کے بعد: آہستہ سے کہو۔

میں

ظرف مکان کے ساتھ۔ جیسے،

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ مجھے گلی میں ملا۔

جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں

ح خالی جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ۔ منہ میں دانت پیٹ میں آنت۔ مرد ہو تو میدان میں آؤ۔ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ شیشے میں اتر آئی۔

ظروف زمان کے ساتھ: جیسے، آٹھ میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ دیر میں آنے سے نہ آنا اچھا۔ سیر کا مزا چاندنی رات میں۔ سال میں ایک بار ہفتے میں چار بار۔ آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے۔ گھڑی میں تولا گھڑی میں ماشہ۔

حالت یا کیفیت، طور یا طریقے کے لئے۔ جیسے، وہ غصے میں ہے۔ رنج میں یا خوشی میں ہے۔ وہ مارے خوشی کے آپ میں نہیں سماتا۔ ہوش میں آؤ۔ اللہ کے نام میں برکت ہے۔ حرکت میں برکت۔ بتیس دانتوں میں ایک زبان۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ دم آ گیا۔ اس کی زبان میں اثر ہے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ دل میں کھوٹ ہے۔

اظہارِ نسبت کے لئے۔ جیسے عمر میں بڑا۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہے۔

مقابلے کے لئے۔ جیسے، مجھ میں اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لاکھ میں ایک ہے، آدمی آدمی میں کیا فرق ہے۔

وزن کے لئے۔ جیسے، تول میں کم ہے، سیر میں چار چڑھتے ہیں۔

تعداد کے ساتھ۔ جیسے، دس آدمیوں میں تقسیم کرو۔ سو میں کہہ دوں، لاکھ میں کہہ دوں، بیس میں کیسے گزر ہوگا۔ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہم میں بھی ہیں، پانچویں سواروں میں۔

تمیز کے لئے۔ (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے، حقیقت میں، آخر میں، باتوں باتوں میں، ہنسی میں، خوشی میں وغیرہ۔

سے

کسی شئے کی ابتدا یا ماخذ کو ظاہر کرتا ہے۔ کبھی ابتداء بہ لحاظ مکان۔ جیسے سر سے پاؤں تک۔ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔ اس سرے سے اس سرے تک۔ زمین سے آسمان تک۔ کہاں سے کہاں تک۔

بہ لحاظ زمان۔ جیسے، چھے بجے سے بیٹھا ہوں۔ صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ کل سے یہی عالم ہے۔ برسوں سے اس مخمصے میں گرفتار ہوں۔ مدت سے، قدیم سے وغیرہ۔

بہ لحاظ تعداد کے۔ چھے سے سات تک۔

ماخذ یا اصل۔ جیسے، وہ عالی خاندان سے ہے۔ یہ کہاں سے آیا ہے۔ زمین سے نکلا ہے۔ عین کی آواز حلق سے نکلتی ہے۔

نسبت یا علاقہ۔ جیسے، مجھے کام سے کام ہے اس سے مجھے کیا تعلق۔ اسے پڑھنے سے نفرت ہے۔ آنکھوں سے اندھا، کانوں سے بہرا، دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔

مقابلہ۔ جیسے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ سخی سے شوم بھلا۔

استعانت۔ جیسے تلوار سے فتح کیا۔ قلم سے لکھا۔ ڈنڈے سے خبر لی۔ شاہ صاحب کی دعا سے اچھا ہو گیا۔

انحراف۔ جیسے قول سے، بات سے، وعدے سے پھر گیا۔ راستے سے لوٹ گیا۔

علاحدگی یا جدائی۔ جیسے، وہ نوکری سے الگ ہوگیا۔ کام سے گھبراتا ہے۔ شہر سے نکل گیا۔ کام سے جی چراتا ہے۔ دل سے اتر گیا۔

تمیز (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے خیر سے شوق سے، دل سے وغیرہ۔

(ف) بعض جملوں میں 'سے' اور 'کے' کے استعمال سے بین فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا فرق بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً 'کمرے کے باہر اور کمرے سے باہر' میں فرق ہے۔ کمرے کے باہر کے معنی ہیں کمرے کے باہر کی طرف اور کمرے سے باہر یعنی کمرے کے اندر نہ ہونا۔ جیسے، کمرے کے باہر بیٹھو، کمرے سے باہر جاؤ۔

اسی طرح کس لئے اور کس کے لئے، میں فرق ہے۔ کس لئے کے معنی ہیں کیوں یا کس غرض سے اور کس کے لئے، یعنی کسی شخص وغیرہ کے واسطے۔

تک

انتہا کے لئے، بہ لحاظ مکان۔ جیسے، شہر تک سرے سے پاؤں تک۔

بہ لحاظ زمان۔ جیسے، شام تک، مہینہ بھر یا سال بھر تک۔ چھ بجے تک۔

عام اشیاء اور خیالات کے لحاظ سے۔ جیسے، مجھ تک، اس کا نام تک نہ لیا خبرت نہ ہوئی۔ سلام تک نہ لیا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ خیال تک نہ آیا۔ گمان تک نہ تھا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالب)

اصل میں 'اوپر' سے ہے 'پر' کا مخفف 'پہ' بھی (اہل لکھنو زبر سے اور اہل دہلی زیر سے بولتے ہیں) انہیں معنوں میں آتا ہے۔

'پر' کسی شئے کی اوپر کی سطح سے تعلق ظاہر کرتا ہے، خواہ متصل ہو یا منفصل۔ اس کے بعد قربت اور درمیان کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

بہ لحاظ مکان۔ جیسے، خدا کا دیا سر پر، چھت پر، بنارس گنگا پر واقع ہے۔ دروازے پر کھڑا ہے۔

بہ لحاظ زمان۔ جیسے، وقت پر کام آیا۔

انحصار جیسے میری زندگی اسی پر ہے۔ ایک مجھی پر کیا ہے۔ سب کا یہی حال ہے۔

خاطر کے معنوں میں۔ جیسے، وہ نام پر مرتا ہے۔ روپئے پر جان دیتا ہے۔

واسطے کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے، کام پر گیا ہے، مہم پر گیا ہے۔

طرف کے لئے۔ جیسے، اس کی باتوں پر نہ جانا۔ اس پر کسی کا خیال نہ گیا۔

تر دامنی شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

آگے

مکان کے لئے آتا ہے۔ جیسے،

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے (غالبؔ)

مقابلے کے لئے۔ جیسے میرے آگے اس کی کیا حقیقت ہے، یعنی میرے سامنے۔

زمان کے لئے جیسے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی

اب کسی بات پر نہیں آتی (غالبؔ)

ساتھ

ایک تو معیت کے عام معنوں میں ہے۔ دوسرے جب ضمیر کے ساتھ آتا ہے تو 'باوجود' اور باوصف کے معنی دیتا ہے۔ جیسے، اگرچہ اس وقت اس نے صاف جواب دے دیا لیکن اسی کے ساتھ آئندہ کا وعدہ بھی کیا۔

انٹرویو

گفتگو بند نہ ہو

(مابین- ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور علی سردار جعفری)

۱۸/اپریل ۱۹۹۰ء کا ایک روشن دن- صبح گیارہ بجے کا وقت- اور علی سردار جعفری کا ''سیتا محل'' والا رہائشی فلیٹ- جہاں مختصر سے وزٹینگ روم میں- دیوار سے منسلک کتابوں کا ایک بڑا سا شیلف- صاحب خانہ کی علمیت اور مطالعہ کا مظہر- کمرے کے دائیں گوشے میں ایک چھوٹی سی میز- جو دنیا کی قیمتی تحریروں کی جائے پیدائش- ایک قلم- اپنی شہنشائیت کا اعلان کرتا ہوا- میز پر چند چنندہ کتابیں۔ ایک پیڈ- ایک ٹیبل لیمپ- جوش بیداری اور شب نویسی کا غماز- میز سے اس طرف دیوار سے لگا ہوا ایک کوچ- جس پر ڈاکٹر راہی معصوم رضا اپنی حق گوئی و بیبا کی اور پورے طمطراق کے ساتھ جلوہ گر- پاس ہی پان کی ایک ڈبیا- دوسری دیوار سے لگے ہوئے کوچ پر رباب آپا اور ستارہ آپا ہمہ تن گوش- چکر دار کرسی پر ترقی پسند تحریک کا ہیرو، اپنے لفظوں کے ہتھیاروں سے لیس- ادھر شیلف کے پاس بچھی ہوئی دو کرسیوں پر سلطانہ جعفری یعنی اردو شاعری کی وینس اور دوسری کرسی پر خاکسار- یعنی رفیعہ شبنم عابدی- بیچ میں ایک لمبی سی تپائی- جس پر ایک ٹیپ ریکارڈ بڑی دیر سے شرکائے گفتگو کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے- میں نے کہا۔ ''راہی صاحب! آپ گفتگو شروع کیجیے۔ میں ریکارڈ کرتی جاؤں گی۔''

راہی صاحب نے ''مہا بھارتی'' شان و شکوہ کے ساتھ اپنی شیروانی کی ''زنبیل'' (میں اسے جیب نہیں، زنبیل ہی کہوں گی) سے ایک پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈ نکالا اور مسکرا کر مخاطب ہوئے۔

''دیکھو رفیعہ!- یہ میرا ٹیپ ریکارڈ ہے۔ مگر تمھارے لیے نہیں۔ اسے میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''منظور- چلئے۔ مگر اعلان کے طور پر الفاظ کا شنکھ بھی تو بجایئے۔''

اور پھر 'الفاظ' کا شنکھ بج گیا۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے پہلو بدلا۔ پان کی ڈبیا میں سے ایک گلوری نکال کر منہ میں ڈالی۔ اور پھر۔

ع

دیکھئے انداز گل افشانی گفتار

گفتگو شروع ہوئی..... بات سے بات چلی۔ صبح ملاقات چلی۔

ہاتھ میں ہاتھ لیے، سارا جہاں ساتھ لیے

تحفۂ درد لیے، پیار کی سوغات لیے

تیکھی نظریں ہوں، ترش ابروئے خم دار رہیں

بن پڑے جیسے بھی، دل سینوں میں بیدار رہیں

انھیں بیدار دلوں کا یہ سرمایہ قارئین کی نذر ہے۔اس گفتگو کے دوران اکثر مقامات پر مجھے اختلاف رائے ہوا۔آپ کو بھی ہوسکتا ہے۔مگر یاد رہے.....گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔یاد رہے یہ محض دو ذہین شاعروں اور ادیبوں کے مابین ایک گفتگو ہے۔انٹرویو نہیں (رفیعہ شبنم عابدی)

ڈاکٹر راہی معصوم رضاؔ: اچھا تو میں آپ کو پریشان کرنا شروع کرتا ہوں۔سب سے پہلے تو بھائی؛ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج آپ سے کچھ گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔اس سے میں ذاتی طور پر یہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ میرے اپنے ذہن میں جو الجھنیں ہیں وہ صاف ہو جائیں کیوں کہ آپ ہمارے ان بزرگ شاعروں نقادوں اور مفکرین میں سے ہیں جنھوں نے ہماری رہنمائی کی ہے اور ہمارے سیاسی شعور کو بڑھنے اور صحیح یا غلط راستے پر چلنے میں مدد کی ہے۔

سردار جعفری :(ہلکے سے تبسم کے ساتھ) یہ غلط لفظ بہت 'صحیح' ہے۔کیا خوب! صحیح یا غلط راستہ

راہی :میں گفتگو شروع یہاں سے کرنا چاہتا ہوں کہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں جب یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا جائے تو اس وقت جو بزرگ تھے۔جن میں آپ بھی ہیں۔ایک طرف پریم چند، مولانا آزاد اور حسرت موہانی کا سلسلہ جاتا ہے۔تو آپ لوگوں نے کچھ بنیادی سوال ادب کے لیے اٹھائے تھے۔اس وقت میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج ۱۹۹۰ء میں، یعنی ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کا جو ہمارا ذہنی سفر ہے۔تو کیا آپ یہ چاہیں گے کہ ان سوالوں پر دوبارہ غور کیا جائے۔یا ان بنیادی سوالوں کی شکل میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں گے۔کیا آپ یہ سوچنا چاہیں گے کہ وہ سوال اب IRRELEVANT ہو گئے ہیں، اور اب نئے سرے سے کچھ نئے، کچھ دوسرے سوال اٹھانا چاہیے۔

جعفری صاحب :اس وقت آپ یہ واضح کر دیں کہ کون سے سوال ذہن میں ہیں؟ یعنی نوعیت سوالوں کی کیا ہے۔

راہی صاحب :ادب کے بارے میں آپ لوگوں نے جو ایک پورا رویہ بنایا تھا کہ ادب کو ایلیٹ کلاس میں نہیں جانا چاہیے۔ادب عوام کی بہبود کے لیے ہے اور عوام کی لڑائی کے لیے ہے۔اور ادب کو وہ جو ویسٹیڈ انٹرسٹ والا کلاس ہے ان کے خلاف لڑنا ہے، عوام اور دنیا اور اپنے ملک کی بہبود کے لیے.....اور اسی میں یہ بنیادی سوال اٹھا تھا کہ ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا۔جمالیات کا یہ سوال اسی سے نکلا تھا۔کیونکہ اب تک۔ہمارا ادب جو تھا وہ ایلیٹ میں پھنسا ہوا تھا۔اور لگ بھگ انھیں کے مسائل کے بارے میں سوچتا تھا، اور انھیں کے نقطۂ نگاہ کے حساب سے سوچتا تھا۔اور ہمارے شعرا بھی اسی انداز سے سوچ رہے تھے (جن میں مولانا حسرت موہانی الگ سے ایک سیکشن ہیں جنھوں نے اردو غزل کو سمجھئے کہ متوسط طبقے کے قریب لانے کی کوشش کی تھی تو۔۳۶ء میں جو سوال آپ لوگوں نے اٹھائے تھے کیا اُن سوالوں پر دوبارہ غور کرنا آپ ضروری سمجھتے ہیں؟ یا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سوال بعینہٖ ویسے کے ویسے

ہیں یا کچھ نئے سوال اپنے آپ سے کرنے پر آپ تیار ہیں؟

جعفری صاحب :بہت اہم ہے یہ بات اور جواب دینا اس کا آسان نہیں ہے۔اس لیے.....

راہی صاحب :میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کو پریشان کروں گا۔

جعفری صاحب :ضرور کیجیے۔واقعی۔جواب دینا آسان نہیں ہے۔پھر بھی ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا۔میں ذاتی تجربے کو ملا کر چلوں گا۔تو زیادہ اچھا ہوگا۔جس وقت یہ تحریک شروع ہوئی اس وقت تین چار گروپ نوعمر ادیبوں کے مختلف مقامات پر کچھ سوچ رہے تھے۔چنانچہ ہم سے پہلے.....سال دو سال پہلے کہنا چاہیے یا تین سال پہلے.....اختر حسین رائے پوری ناگپور میں گاندھی جی کے ساتھ، نہرو جی کے ساتھ مل کر سوچ رہے تھے۔ان کے سوچنے کا ایک طریقہ تھا۔پھر لنابن میں سجاد ظہیر اور.....لوگ سوچ رہے تھے۔ہم لوگ علی گڑھ میں سوچ رہے تھے۔تو پہلے تو میں اس فضا کا اور اس ماحول کا ذکر کروں گا جس ماحول میں ہم سوچ رہے تھے۔اس لیے کہ وقت اور مقام یہ دو بہت اہم ہوتے ہیں۔(اب میں سیاسی راہ پر جانے پر مجبور ہوں گا۔اس وقت یورپ میں فاشزم کا عروج تھا اور ہندستان میں ہم امپریلزم کے خلاف لڑ رہے تھے۔اور ہمارے ادب میں جو ہماری روایت تھی اس کا براہ راست رشتہ ہمارے سماج سے ہمارے بزرگ قائم کر چکے تھے۔اس کی وجہ سے سب کے ذہن میں یہ ایک سوال تھا کہ ہم اپنے اس ادب کا استعمال (استعمال کے لفظ پر ہمارے بعض لوگ جمالیاتی نقطہ نگاہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب ادب کو آپ استعمال نہیں کر سکتے۔) لیکن ہمارے ذہن میں یہ چیز تھی کہ ہم اپنے اس ادب کو عوام کی بہبود کے لیے استعمال کریں گے۔اور اس کے لیے زبان کی تبدیلی ہمیں بہت ضروری محسوس ہوئی تھی۔جب پریم چند نے کہا تھا کی ہمیں ہوگا اس حسن کا معیار بدلنا ہوگا تو اس کے پیچھے زبان کی تبدیلی بھی شامل تھی۔اور وہ کردار بھی شامل تھے، سماج کے وہ طبقے بھی شامل تھے جو نظر انداز ہوتے تھے۔اب اس کو اگر میں حسرت کے رشتے سے چونکہ ان کا نام آیا اور غزل کے تعلق سے شروع کروں تو غالب کی غزل میں اور حسرت کی غزل میں جو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔یہ وہ ہے کہ حسرت اردو غزل کی محبوبہ کہ درمیانی طبقے میں تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے اور ایسے کامیاب ہوئے کہ لوگوں کو ناگوار نہیں گزرا اور نہ محبوب کا ننگے پانو آنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔اور پھر کوٹھے، کے لفظ کا استعمال.....کہ.....

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

غالب کے ہاں آپ کو 'بام' ملے گا۔(اس سے ذرا آگے اگر چلیں) تو جوش ملیح آبادی نے ایک وسعت یہ دی کہ لالہ وگل جس میں ساری بہار سی جاتی تھی، اس کی توسیع بھی کر دی۔انھوں نے بیلے کے پھولوں کا ذکر کیا۔

گیندے کے پھولوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے پتوں کے دونوں کا ذکر کیا۔ جامن والیوں کا ذکر کیا۔ مہترانی پر بھی انھوں نے نظم کہی۔ جس پر ان پر بہت لعنت ملامت کی گئی۔ تو یہ ادب کی ایک جنبش عوام کی طرف تھی۔

میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا اردو غزل آشنا مزاج نثر میں بھی، جس میں آرائشی حقہ بہت زیادہ ہے اور اس آرائشی حصے کی وجہ سے ہم بعض اوقات افکار کی بلندی اور وسعت تک نہیں پہنچ پاتے۔ اور انھیں لفظوں میں سے ہم وسیع تر معنی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اگر ہم انگریزی سے مثال لیں تو آج ۱۹۹۰ء میں انگلستان کا کوئی شاعر (روایتی انداز سے کہ رہا ہو یا غیر روایتی انداز سے) شیکسپیر کی زبان میں شاعری نہیں کرتا۔ ملٹن کی زبان میں شاعری نہیں کرتا۔ حد یہ ہے کہ کیٹس اور شیلی کی زبان میں بھی شاعری نہیں کرتا۔ لیکن ہم آج بھی حافظ شیرازی کی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ اور ہماری تمام غزلوں میں الفاظ کا ایک سیٹ SET ہے۔ کوئی پانچ سو الفاظ کا، انھیں سے ہم بڑے مفاہیم پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ تو ایک امیجری STYLISED ہوگئی ہے۔ اور دوسری چیز اس کے ساتھ کیا ہوتی ہے کہ وہ ایک استعارہ بن گیا ہے۔ استعارہ بننے کی وجہ سے اسی ''میخانے'' کا لفظ جو ہے، وہ مختلف مقامات پر مختلف معانی اختیار کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے ابھی امام خمینی کی غزلیں پڑھی ہیں، فارسی میں، معلوم نہیں آپ کی نظر سے گزریں یا نہیں۔

ر : جی نہیں۔

س : امام خمینی کی غزلیں..... جن میں اس طرح کے اشعار..... کہ میں مسجد و مدرسہ سے بیزار ہو کر میخانے میں آ گیا ہوں۔ تمھاری آنکھوں کا دیوانہ ہو کر میں عاشق ہو گیا ہوں وغیرہ اور اس پر عنوان یہ ہے کہ یہ امام خمینی کی روحانی شاعری ہے۔ بہت صحیح ہے صاحب- یہی غزل جب کوئی ترقی پسند کہتا ہے کہ میں مسجد و مدرسہ سے بیزار ہو کہ میخانے میں آ گیا ہوں تو اُسے انقلابی معانی دے دیے جاتے ہیں اور جب کوئی لکھنو کا روایتی شاعر کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ فرسودہ شاعری ہے۔

ر : ہاں تو یہاں بھائی: (قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں۔) آپ کے کہنے سے جو بات نکل رہی ہے وہ یہ کہ شعر کا مطلب قاری اپنے لیے خود نکالتا ہے.

س : وہ تو ہر طرح سے نکالے گا ہی!

ر : مثلاً یہ کہ جب ہم پڑھتے ہیں کہ یہ شعر امام خمینی کا ہے تو ہم اس کا دوسرا مطلب نکالتے ہیں، اور جب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہی شعر سردار جعفری کا ہے تو ہم اس کا دوسرا مطلب نکالتے ہیں۔ اور- یہی شعر اگر اختر الایمان نے کہا ہو۔ (حالانکہ ایسا ہوگا نہیں۔ اور کہا نہیں جائے گا) تو ہم اس کا تیسرا مطلب نکالیں گے۔ تو..... تفہیم تو قاری کا حق ہے۔

س : میں تقسیم پر ذرا بعد میں آؤں گا۔ میں تو ARCHAIC زبان کی بات کر رہا ہوئی۔ مثال کے طور پر ''زمین کوئے جاناں''..... یہ ترکیب ہم جب بھی استعمال کریں گے، داد مل جائے گی کسی جگہ بھی..... ابھی میں نے جو اس وقت پورے یورپ میں سوشلزم

میں جو انقلاب ہو رہا ہے۔ یا ''بحران'' کچھ لوگ اسے کہتے ہیں۔ اس میں میں نے چند اشعار کہے ہیں۔ وہ پورے کے پورے روایتی زبان میں ہیں اور شروع کا ایک مکڑا اس میں ہے کہ

عقیدے بجھ رہے ہیں، شمع جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوق جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی

اب دیکھئے ''شمع جہاں.....''

ر :ہاں..... ''عقیدے بجھ رہے ہیں'' یہی نئی بات ہے۔ پھر ذوق جنوں کی شعلہ سامانی.....

س : خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے۔

اب دیکھئے یہ ''زمین کوئے جاناں'' اس میں.....

ر :مگر بھائی اگر ہمارے بزرگ شعرا نے یہ مصرع کہا ہوتا تو ''ذوق جنوں'' نہیں کہتے۔ ''شوق جنوں'' کہتے۔ یہ جو ذوق ہے ''ذوق'' ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ یہ لفظ۔

س :اب اسی میں یہ شعر آ جاتا ہے۔ اس قسم کا..... کہ

پریشان روزگار آشفتہ حالاں کا مقدر ہے
کہ اس زلف پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی

ر :پریشانی نہیں جاتی..... واہ!.....

س :خالص روایتی..... لیکن اور اس کے بعد ایک شعر آتا ہے۔

نئے خوابوں کے دل میں شعلۂ خورشید محشر ہے

ر :نیا..... جدید..... ع نئے خوابوں کے دل میں شعلۂ خورشید محشر ہے

س :جی ہاں..... بالکل اور آگے.....

خمیر حضرت انسان کی سلطانی نہیں جاتی

تو یہ جو DEMOCRATIC MOVEMENT ہے، اس کی طرف اشارہ ہے۔ ہاں تو میں ARCHAIC کی زبان کی بات کر رہا تھا۔ کشمیر میں، جاڑوں کے زمانوں میں جموں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یونی ورسٹی گیا، تو دسمبر کا مہینا تھا دھوپ میں لڑکے لڑکیاں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جگن ناتھ آزاد سے کہا بھی میری ایک نظم میں ایک شعر ہے کہ۔

راستے دوڑ کے اسکولوں سے مل جاتے ہیں
بچے پھولوں کی طرح گھاس پہ کھل جاتے ہیں

مگر یہ شعر غزل آشنا مزاج کو خوش نہیں کرتا۔ ہم آپ اس شعر سے خوش ہو سکتے ہیں۔ دنیا کی کسی شاعری میں جب یہ خیال آئے گا، اس کی داد ملے گی۔ یا میں نے ''نئی دنیا کو سلام'' میں اس قسم کے مصرعے بھی کہے ہیں۔

چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں گانو کی لڑکیاں،
چوڑیاں گنگنا میں نہیں

غزل آشنا مزاج سے باہر۔ وہ اس سے خوش نہیں ہوتا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں وسعت کی سخت ضرورت ہے۔ خاص طور پر زبان میں..... روایت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ زبان کی وسعت بھی نئے مفاہیم کے ساتھ نئے انداز کے ساتھ یہ چیز کرنی چاہیے۔

ر : بھائی یہاں ایک سوال میں کھو جتا چلوں۔ یہ جو ARCHAIC زبان آپ سے کہہ رہے ہیں اس زبان سے ہماری جان پہچان تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔

س :جی نہیں صاحب۔ تقریباً ایک ہزار سال پرانی ہے۔ فارسی سے۔

ر :جی میں تو اپنے یہاں کی بات کر رہا ہوں۔

س :ہاں اپنے یہاں بھی تقریبا تین سو سال پرانی۔

ر : ہاں تو یہ ڈیڑھ دو سو سال پرانی جان پہچان ہے۔ اور ہم اس میں رچے بسے ہیں اور اس میں بھی کہ زباں میں ہر استعارے کو ہمارے بزرگوں نے کیسے استعمال کیا تھا اور ان کے قارئین نے انھیں کیسے سمجھا تھا۔ وہ تو ہماری ایک رشتہ داری ہے ان لفظوں سے۔ وہ جو حالؔی نے ایک بات کہی تھی کہ بھائی نئی بات کہو۔ اور فارم کو مت بدلو۔

س :اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔

ر : ہاں تو.....ایک نہ ایک سہارا تو آپ اپنے قاری کو دیں گے نا؟ کہ جس کی انگلی پکڑ کر وہ ہمارے شعروں کی گلیوں میں جائے۔ ہم خیال بھی ایسا دے رہے ہیں جو اس کے لیے اجنبی ہے اور زبان بھی ایسی دے رہے ہیں، جو اس کے لیے اجنبی ہے تو اس میں اس کا اندیشہ ہے کہ اس کا دل اچاٹ ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ARCHAIC زبان جس کو ترقی پسندوں نے استعمال کیا۔ اور جسے آپ ARCHAIC کہہ رہے ہیں وہ سب سے بڑا کارنامہ ہے ترقی پسند ادیبوں کا کہ انہوں نے اس زبان کو جس زبان سے ہم واقف تھے، اس کی وہی استعمال کی لیکن ان الفاظ کے مطالب میں یکسر بڑی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔

ر: بالکل صحیح۔ اگر اس کے بدلے آپ نے کوئی نئی زبان گڑھی ہوئی تو جہاں تک آپ پہنچے میرے خیال میں وہاں تک پہنچنے میں آپ لوگوں کو دقت ہوتی۔

س: نہیں..... یہ تو صحیح ہے کہ جو زبان ہم نے استعمال کی، پرانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے اس کو وسعت دی۔ اور جب تک کہ زبان میں ایسی وسعت نہیں آئے گی، اس وقت تک ہم زیادہ بڑے طبقے تک نہیں پہنچ سکتے۔

ر: بالکل صحیح.....جیسا کہ آپ نے کہا..... چوڑیاں گنگناتیں نہیں۔ یہ تو حسرت کی روایت ہے۔

س: جی ہاں.....حسرت کی روایت ہے۔ جوش کی روایت ہے۔

ر: جو آپ کو ان سے ورثے میں ملی۔ اور ہم کو آپ سے ورثے میں ملی۔ اور ہمارے بعد ہم سے دوسروں کو ورثے میں ملے گی۔ تو زبان ترقی کرے گی ہی۔

س: لیکن زبان کے علاوہ بھی ایک اور چیز ہے۔ وہ یہ کہ ایک مقام پر ہم نے پسپائی قبول کی ہے۔ گذشتہ ۵۰ سال میں.....وہ یہ کہ..... ہم کامیاب ہوئے۔ مجموعی حیثیت سے انفرادی حیثیت سے کوئی شاعر کم تر ہے، کوئی بلند تر..... یہ ایک الگ بات ہے۔ اور اس کامیابی میں جو سب سے بڑا FACTOR تھا، عنصر تھا- وہ یہ تھا کہ ہم نے عام زندگی اور عام انسانی مسائل اور نفسیات..... ان کو لیا۔ ان سے ہم نے منہ نہیں موڑا۔ اور ان سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ اور اسی وجہ سے ہمیں کامیابی ملی۔ لیکن ہمارے کچھ مخالفین بھی تھے۔ اور وہ شروع سے اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس لیے کہ وہ ان نئے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ جب سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات کی وجہ سے قدروں کی شکست وریخت شروع ہوئی جو آج اس منزل پر پہنچی ہے تو ہم میں سے کچھ لوگوں نے (میں ان میں نہیں ہوں) اس کو قبول کر لیا کہ ہاں صاحب! ہم غلطی کر رہے تھے۔ ہم کو کچھ بہت ہی عمومی اور عوامی انداز میں کہنا چاہیے تھا۔ کچھ اس طرح سے کہنا چاہیے کہ داد مل جائے۔ لیکن اچھے شاعر یا اچھے ادیب کا کام داد حاصل کرنا نہیں ہے۔ اس کا کام ہے راستے بنانا۔ اس لیے وہ سوالات اپنی جگہ پر بالکل باقی ہیں جو سوالات ۳۶ء میں ہم نے اٹھائے تھے اور جن سے ہم مکمل طور پر نہیں۔ کسی حد تک عہدہ برآ ہو سکے تھے۔ آج وہ زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔ بھئی رشید احمد صدیقی صاحب نے ترقی پسند تحریک کو داد دی تھی اس بات کی- (حالانکہ وہ اس تحریک کے بہت بڑے مخالف تھے) کہ ترقی پسند تحریک نے فرقہ پرستی کے خلاف جو کارنامہ کیا ہے وہ اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اور شکر گزاری کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ آج اس سے زیادہ شدید حالات ہیں اور اس لیے ہمارے ہاں بعض لوگوں میں یہ سنی سزم (CYNISM) پیدا ہو گئی ہے کہ ہم انسان کی مکمل شکست کو اپنا موضوع بنائیں۔ اور انسان کی جدوجہد کو اپنا موضوع بنائیں یہ رویے کی بنیادی تبدیلی ہے۔ اور اس طرح رویے میں بڑی بھاری تبدیلی آئی ہے۔ اس تبدیلی کے زیر اثر وقتی طور پر ہمارے کئی ترقی پسند ہیں جنھوں نے پسپائی قبول کی۔

ر :ایک آدھ شعر ان کا سنائیں گے۔

س :اس طرح کے اشعار-نہیں بھی بڑا مشکل ہے۔ اس طرح کے اشعار اس لیے بھی نہیں سنانا چاہیے۔ کہ مایوسی بھی شاعر کا، ادیب کا حق ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ کسی وقت میں بالکل مایوس ہو جائے اور نکل آئے لیکن میں تو اس پسپائی کا ذکر کر رہا ہوں۔

ر :جہاں انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

س :ہتھیار ڈال دیے اور یہ کہہ کے کہ ہاں صاحب آپ صحیح کہہ رہے تھے کہ ہم غلطی پر تھے۔ تو صاحب ایک چیز یہ ہے۔ دوسری چیز

اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ ہمارے یہاں انتہا پسندی اور تنگ نظری رہی۔ جس سے تحریک کو نقصان پہنچا۔ اور اس میں ہم نے کسی کو نہیں بخشا۔ اور اس کا ردعمل بھی ہوا۔ لیکن اب ایک توازن پھر قائم ہوا ہے۔ کیونکہ ان رویوں پر نظر ثانی بھی کی گئی۔ اور کی جانی چاہیے۔ ادب کی تقویت کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ان رویوں کے اختیار سے جو بڑی شاعری ہوئی یا جو بزرگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی اس کا بھی میرے پاس ایک جواز ہے۔ (یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ضروری نہیں کہ ہر شخص اس کو تسلیم کرے) وہ یہ ہے کہ جب کوئی بڑی تحریک یا کوئی اہم ادیب یا شاعر آتا ہے اور وہ اپنے لیے زمین تیار کرنا شروع کرتا ہے تو وہ اپنے بزرگوں کے بعض رویوں سے اختلاف کرتا ہے۔ بقول غالب کہ

آنکس کہ شد صاحب نظر، پیر مغان را خوش نکرد

میں یہاں ہے۔ اُدھر کو چلوں کہ صاحب ہم نے اقبال پر حملہ کیا۔ اقبال نے حافظؔ شیرازی پر حملہ کیا۔ اقبال اپنا راستہ نہیں بتا سکتے تھے کیونکہ ان کا جو آہنگ ہے، ان کا جو فلسفہ خودی ہے اور جو وہ ملت کو بیداری کا سبق دے رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو حضرت موسیٰ نے TEN COMMANDMENTS دیتے تھے کوہ طور سے نہیں بولتا بلکہ محبوب کی گلی میں سے بولتا ہے اور میخانے کے دروازے سے بولتا ہے تو وہ حافظ ان کو ناگوار تھا۔ لیکن حافظؔ نے بڑا سخت انتقام لیا اقبال سے اور وہ یہ کہ اقبال کی ساری فارسی غزل۔

ر : حافظ کے رنگ میں نہائی ہوئی ہے۔

س : ہاں جی۔ پیام مشرق..... سارا حافظؔ کا دیوان ہے میں نے اس کو اس طرح کے کہا ہے کہ شیرانہ کے بلبل نے لاہور کے شاہین کو پٹخ دیا۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ ہم اپنا توازن قائم رکھیں۔ اقبالؔ نے نظر ثانی کی اپنے رویے پر حافظ کے سلسلے میں۔ ہم نے اقبال کے سلسلے میں نظر ثانی کی اور ہمارے آج کل کے نوجوان۔ وہ جب ہم پر حملہ کرتے ہیں تو ہم نے یہ دیکھا ہے۔ (ایک اور چیز بھی دیکھی ہے۔ اس پر بحث نہیں کروں گا۔ وہ یہ کہ..... تھوڑی دیر کے معذرت کا انداز اختیار کرتے ہیں کہ ''نہیں صاحب ہم نے یوں نہیں کہا تھا۔ ہم نے تو یوں کہا تھا'' تو میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی کھل کے کہو۔ اس لیے کر تم اپنا ....

ر : بھائی اس میں کیا ہے کہ پہلے نظر ہو تو تب نظر ثانی ہونا؟

(قہقہہ)

بنیادی سوال تو وہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ نظر ہے کہ نہیں، کیونکہ جب ہم کسی سوال پر سوچیں گے تو ہم آگے چل کے پھر اپنے کو REVISE کریں گے کہ نہیں بھئی ہم نے یہ غلط کیا ہے۔ ہم نے یہ صحیح کیا۔ یا ہم کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا یا ہم کو شدت کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نے تو سوچنے کا کام لگ بھگ بند کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ.....

س : آج کل تو اور بند ہو گیا ہے۔

ر : جی ہاں۔ اس لیے.....

س :لیکن اس تحریک نے جو بہت بڑا کام کیا ہے وہ یہ کہ میں اسی بات پر جا رہا ہوں کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا''۔اس نے الفاظ کے معانی بدل کے نئے تصورات ڈھال دیے۔جیسے کہ اقبال نے 'خودی' کے لفظ کے معنی بدل دیے۔مجاز نے آوارہ کے معنی بدل دیے۔مجاز کی نظم ''آوارہ'' کو میں اس عہد کی نہیں بلکہ پوری ترقی پسند تحریک کی بڑی نمائندہ نظم سمجھتا ہوں۔اور یہ بڑی نظم ہے۔اس کا شمار بڑی شاعری میں ہوتا ہے۔میں سمجھتا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجاز نے ایک بڑی نظم کر دی تو وہ بڑے شاعر ہو گئے۔عظیم ان معنوں میں نہیں ہو سکتے۔میں بڑی شاعری کے لیے تین چار چیزیں استعمال کرتا ہوں۔ایک تو سہولتِ اظہار (فارسی کے اعتبار سے یہ ترکیب غلط ہے لیکن میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔) جو ہمارے اساتذہ کی دین ہے کہ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

ر :سہل ممتنع جسے کہتے ہیں۔

س :جی ہاں۔سہل ممتنع۔تو میں اظہار کے لفظ کے ساتھ چلتا ہوں۔اس کے ساتھ ندرت اظہار کہ جو تخیل کی کارفرمائی ہے۔اور اس کے بعد ''عظمت اظہار'' جو فکر کی کارفرمائی ہے۔اس کی وجہ سے اس میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔مجاز کے ہاں سہولتِ اظہار کے ساتھ ساتھ ندرتِ اظہار بھی استعمال کیا ہے۔اور اس میں فکر کی ایک نئی نہج ہے۔اور اس نئی پنج میں- میں نے اس پر غور کیا- کہ ہمارے اساتذہ کے ہاں شاید نہیں ملے گی یہ چیز.....لیکن میں یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔جوش کہ ہاں موجود ہے اور مجاز کے ہاں موجود ہے کہ تشبیہ اور استعاروں سے ہم نے سماجی تنقید رہے کام لیا۔میں پہلے جوش کا ایک شعر سناؤں پھر مجاز کی ''آوارہ'' کا ایک بند سناؤں۔

جوش کی ''گرمی اور دیہاتی بازار'' بہت اچھی نظم ہے ... یہ نظمیں پہلو نرودا کے ہاں بھی ملتی ہیں۔بالکل اسی طرح کی نظمیں۔بازار اور وہی بازار) کیونکہ لاطین امریکہ اور ہندستان دونوں بہت ملتے ہیں۔اس میں ایک شعر ہے کہ

ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے

مجھے شعر اچھی طرح یاد نہیں۔

تیز کرنہیں یوں کہ جیسے روح پہ عکس گناہ

ر :خوب

س : نہیں نہیں شعر غالباً یوں ہے۔

تیز کرنیں جیسے بوڑھے سودخوروں کی نگاہ

دھوپ کی تیز کہ جیسے روح پر عکسِ گناہ

اب یہ جو ہے کہ ''جیسے روح پر عکسِ گناہ'' اور بوڑھے سودخوروں کی نگاہ اس میں پوری سماجی تنقید ہے۔اور پورا ہمارا اس وقت کا سماج زندہ ہے۔آج بھی یہی ہے

اسی طرح مجاز کی آوارہ میں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پہلا ماہتاب
جیسے ملا کا ہاتھ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

اس میں بھی، ان تشبیہوں میں پورا سماجی شعور جلوہ گر ہے۔ اور محل اور اس کا جو پورا رشتہ ہے بنئے کے ساتھ، بیوہ کے ساتھ اور مفلس کے ساتھ.....

ر : غالب نے نہیں کہا تھا کہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یا میر نے کہا تھا۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے رہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

یا

دل کی بربادی کہ اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

تو بھٹی بڑی شاعری تو سماج سے ناتا توڑ کے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

س : میرے خیال میں اس سے تو اختلاف ممکن نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اور ادیبوں نے، شاعروں نے ایک نئی جمالیاتی فضا پیدا کی جو ہماری قدیم جمالیاتی فضا سے مختلف ہے۔

ر : مگر میں پھر پہلے سوال پر لوٹتا ہوں کہ کیا کوئی نیا سوال آپ کرنا چاہیں گے یا ۳۶ء کے سوال ہی کافی ہیں؟

س : نہیں کافی تو کبھی نہیں ہوتے۔ کیونکہ نئے زمانے میں نئے سوال.....

ر : تو نئے سوال کیا وہی ہیں؟

س : نئے سوال تو وہی ہیں جو میں نے کہا کہ ''زمین کوئے جاناں''

ر : اس کے بارے میں تو میں الگ سے سوال کروں گا۔ اچھا دوسرا سوال۔ چونکہ ادھر ہم لوگ زبان ہی کی بات کر رہے ہیں....

س : ہاں ایک چیز اور ہے۔ اچھا- کہ ہم نے اپنے ادب کو سیاست سے ضرورت سے زیادہ وابستہ کیا ہے۔ اس میں کمی کی بڑی ضرورت ہے۔ اور پریم چند نے ہم کو جو بات بتائی تھی اس پر ہم نے عمل نہیں کیا۔ ہم نے اس پر تو عمل کیا کہ حسن کا معیار بدلنا ہوگا مگر.....

ر :سن کو چھوڑ دیا۔

س :نہیں حسن کو چھوڑا تو نہیں ہے۔صرف معیار بدلنا ہے۔لیکن پریم چند نے یہ بھی کہا تھا کہ ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی شے نہیں ہے۔یہ مشعل ہے جو سیاست کے آگے آگے چلتی ہے۔

ر :جو نہیں ہوا۔

س :جو نہیں ہوا۔

ر :اس پر آپ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جو ادب سیاسیت کے پیچھے چلنے لگا۔یہ جو ہماری قومی تحریک تھی جو ہندستان کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی اور اس کے جو رہنما تھے چاہے وہ داہنے ہاتھ والے ہوں، چاہے بائیں ہاتھ والے، چاہے بیچ والے سب کو ادب کی سیاسی اہمیت کا اتنا احساس نہیں تھا جتنا انھیں ہونا چاہیے تھا انھوں نے شاعروں کو مجمع لگانے کے لیے استعمال کیا۔انھوں نے شاعروں کو کسی لیڈر کی تقریر سنانے کے لیے پہلے اسٹیج پر استعمال کیا۔انھوں نے الیکشن میں شاعروں کو پوسٹر کی طرح استعمال کیا۔لیکن ہماری سب سے بڑی پولیٹکل پارٹی جیسے کانگریس۔اس کے کبھی ادب کے مسائل یا ادیب کے مسائل یا ادب کی کیا طاقت ہے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔اب چونکہ لڑائی آزادی کے لیے چل رہی تھی اور جو بھی تھا وہ یہی کہ رہا تھا پنڈت نہرو کے پیچھے چلو۔مہاتما گاندھی کے پیچھے چلو۔فلمانے کے پیچھے چلو۔تو ادیب بھی ان کے پیچھے چلنے لگا۔اس طرح کیا ہماری سیاسی تحریک پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ اس نے.....

س :بے شک سیاسی تحریک پر الزام عائد ہوتا ہے۔اور صرف کانگریس پر ہی نہیں بلکہ ہر سیاسی پارٹی پر۔

ر :میں سبھی پارٹیوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں لیکن ALMOST کانگریس جس نے ترقی پسند تحریک کی رہنمائی قبول کی اس پر بھی یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اس کو ادب کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔

س :ادب کی جمالیات کا کوئی اندازہ نہیں۔ادب کی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہے لیکن اس میں ایک چیز ہے۔وہ یہ کہ- میں ادب کو دو حصوں میں بانٹتا ہوں۔ایک ادب ہمیں چاہیے نیچی سطح کا اور ایک ہم کو چاہیے اعلا سطح کا۔نیچی سطح سے مراد وہ ادب ہے جو ہماری تحریکوں میں سب سے پہلے استعمال ہو سکے۔یہ کام ہم سے بہت پہلے ہوا۔مثلاً بنگال کی تقسیم کے بعد، ٹیگور نے گیت لکھے اور تقسیم کے خلاف جلوسوں میں پڑھے اور ٹیگور نے جو اعلا درجے کی شاعری کی.....

ر :نہیں بھئی.....وہ شاعری جو ہم کریں جلوس میں پڑھنے کے لیے۔اور ایک وہ شاعری جو ہم کرتے ہیں ادب کے لیے، جو ہماری ادبی شاعری ہے-تو وہ شاعری جلوس کے لیے لکھی جا رہی ہے۔وہ تو لکھی ہی جا رہی ہے۔اس لیے کہ وہ ہمارا سیاسی عقیدہ ہے- جس سیاسی جماعت سے ہم منسلک ہیں-اس سیاسی جماعت کو ضرورت ہے اس قسم کی نظم کی۔اس کو تو شاعری ماننا مشکل ہے۔

س :اس کو جماعتی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔کہ یہ بالکل ایسا ہے جیسا میرؔ کا شعر ہے کہ چور اُچکّے .....یا وہ والا شعر-

سنا ہے میں نے اسے گھیتے ترے خلوت نشینوں سے

کہ تو دارو پیا ہے رات کو مل کر کمینوں سے

ر : کیا اب اس کو ہم میر کا نمایندہ شعر کہیں گئے! میرا مطلب ہے کہ ہم جب میر کا مقام متعین کریں گے تو کیا ادب میں اس شعر پر غور کریں گئے۔

س : نہیں نہیں.....عرض یہ تھا کہ یہ اشعار جو تحریک کے لیے استعمال ہوئے...

ر : نہیں اس کو شاعری میں مت لائیے۔

س : شاعری میں کیوں نہیں لائیں؟

ر : نہیں بھی۔ یہ شاعری میں کیسے آئے گا کہ۔

یہ جو ہے ہٹلر کا چیلا، مارے ساتھی جانے نہ پائے

یہ کوئی شاعری ہے؟

س : یہ ضرورت والی شاعری ہے۔

ر : ضرورت تھی اس لیے تک بندی کی گئی۔ مگر اس کو شاعری کا درجہ دینا تو مشکل ہے۔ کم از کم آپ سے مجھ کو اس بات کی امید نہیں تھی۔ میں صاف بات کہہ دوں۔

س : دوسطح کی شاعری۔ بھئی دیکھئے تو سب کے ہاں ملے گی۔

ر : نہیں نہیں۔ ملنے کا سوال نہیں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب آپ میرؔ کے طالب علم ہیں۔ اور جب آپ میرؔ پر کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری پر۔ رتبے کے تعین میں آپ اس پر تو نہیں جائیں گئے نا .... چورا چکے .... فلانا ڈھمکا..... یہ سب

س : رتبے کا تعین تو ہم کرتے ہیں اعلا درجے کی شاعری ہے۔

ر : تو شاعری تو وہی ہے نا؟ جسے آپ اعلا درجہ کی کہہ رہے ہیں؟

س : اور ضرورت والی شاعری جو ہے۔

ر : ضرورت والی شاعری نہیں، تک بندی ہے۔

س : (مسکرا کر) اچھا آپ تک بندی کہہ لیجیے۔

ر : وہ تک بندی ہے۔ ضرورتاً کی گئی۔ سیاسی ضرورت میں چمچہ گیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی دشمنیاں ہوتی ہیں۔

س : (یہاں سامعین میں سلطانہ جعفری کچھ پہلو بدلتی ہیں اور نظیر کی شاعری کو درمیان میں لے آتی ہیں۔ کہ وہ بھی تو ضرورت کی شاعری تھی۔ لیکن اسے ''نیچرل شاعری'' کر کے بات مکمل ہو جاتی ہے۔ معصوم رضا اسے ضروت کی شاعری قرار نہیں دیتے۔ بات پھر آگے بڑھتی ہے۔

س : بھئی دیکھیے ایک شاعری کا عوامی دھارا ہے اور ایک شاعری کا۔۔۔۔۔۔۔۔

ر :میرا مطلب ہے کہ شاعری ایک دھارا ہے۔ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔کہیں کنارے بدل جاتے ہیں، کہیں کشتیاں بدل جاتی ہیں کہیں ویرانہ آجاتا ہے۔کہیں محل آجاتا ہے۔ پر دریا تو بہتا چلا جاتا ہے۔تو اس دریا کو اس کنارے کی وجہ سے کہ یہ عوامی دریا ہو گیا اور یہ خواص کا دریا ہو گیا اور یہ متوسط طبقے کا دریا ہو گیا۔اس طرح سے تو...

س :نہیں اس طرح مناسب نہیں ہے۔ ہے یہ وہی دریا مگر اس دریا میں کہیں تنکے بھی بہہ رہے ہیں اور کہیں گلاب بھی۔

ر :ہاں وہ تو صحیح بات ہے۔لیکن اس طرح کہنا کہ یہ عوامی سطح کی شاعری ہے اور یہ اعلا درجہ کی شاعری ہے تو اس تقسیم کو حلق سے اتارنے میں بھائی ذرا پریشانی ہے۔

س :بھئی اس میں اختلاف کی گنجایش ہے۔میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر شاعر جو ہے دو طرح کی شاعری.....

ر :آپ اپنے شعر سنایئے۔جو عوامی کہے ہوں.....سنایئے۔

س :(سوچ کر) ہم نے کہا ہے کہ.....

آج ٹکراتے ہیں ایوان حکومت سے عوام

ساتھیو لال وسلام

ر :اچھا۔تو اس کو کیا آپ اپنی شاعری -یعنی یہ کہ.....جب کبھی آپ اپنی شاعری کا جائزہ لینے بیٹھیں گے تو کیا اس شعر کا ذکر آئے گا۔کہ علی سردار جعفری شاعر کیسے تھے تو.....

س :اس کا ذکر یوں آئے گا کہ یہ ادنا درجے کی شاعری تھی۔

ر :جب آپ نے خود ہی اس کو کاٹ دیا کہ یہ ادنا درجے کی شاعری ہے۔تو جب ہم ادنا درجے کی شاعری خود ہی مان رہے ہیں، پھر ہم اس کو شاعری کا رتبہ کیوں دیں؟ شاعری کی نکات کیوں دیں؟ بھئی ہماری ضرورت یہ ہے کہ چاہیں بھنڈی خرید کر لے آئیں ۔کیونکہ بھئی آج ہم مرغی نہیں کھا سکتے یا بٹیر نہیں کھا سکتے -تو ٹھیک ہے۔بھنڈی کھائیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ بھنڈی جو ہے وہ بٹیر سے اچھی ہے۔

(خاکسار یہاں یہ کہہ کے مداخلت کرنے کی جسارت کرتا بھی کہ بھنڈی کا بھی تو اپنا مزا ہے اور کبھی کبھی مرغی سے زیادہ لذیذ لگتا ہے۔لیکن راہی صاحب اسے مرغی کا درجہ دینے سے منکر رہے) اور اس اٹل انکار کو دیکھ کر جعفری صاحب نے گفتگو کو ممیّز لگائی۔

س :اچھا صاحب آگے چلیں۔

ر :اب بھائی میں جو اگلا سوال کرنا چاہ رہا ہوں۔وہ زبان کے متعلق ہے۔ابھی زبان کی بات ہو رہی تھی کہ....

س :آپ اس سے متفق ہیں کہ اردو شاعری کی زبان کو وسعت کی ضرورت ہے۔

ر :جی ہاں.....بالکل میرا اپنا سوچنے کا طریقہ بھائی یہ ہے کہ ۳۶ء میں جو ادبی زبان ایجاد کی گئی تھی شاعری کی خاص طور پر۔اس میں ہم نے یہ کیا کہ یہ جو ہمارے پرانے استعارے تھے ان کے مطالب میں توسیع کی اور کہیں کہیں ان کا مطلب بالکل بدل دیا۔

س : صرف استعاروں کا ہی مطلب نہیں بدلا بلکہ کئی ایسے شعر بھی کہے جن کا شمار میں بڑی شاعری میں کرتا ہوں۔ میری نظر میں ہندستان کی پندرہ سولہ زبانوں کی شاعری ہے، کیونکہ میں نے اس پر کام کیا ہے ایک زمانے ہیں۔ میں جذبی کا ایک شعر سناتا ہوں۔

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روئی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

گجراتی کے ایک شاعر ہیں۔ ان کے ہاں بھی یہ خیال ہے اور اس کا شمار گجراتی زبان میں اچھی اور بڑی شاعری میں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ ہو رہا ہے کہ جذبی کی کے اس شعر کو کاٹ دیں گے اور اس شعر کو لے لیں ۔

جب کشتی ثابت وسالم تھی، ساحل کی تمنا تھی کس کو
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اسی طرح سے سری سری کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ مہا پرستھانم۔ ایک زبردست یلغار۔ ہمارے ہاں دو شاعروں نے اسی طرح کی نظمیں کہی ہیں۔ ایک بہار کے جمیل مظہری نے۔

''برادرانِ نوجواں! بڑھے چلو، بڑھے چلو.....'' اور پھر جوشؔ نے اس قسم کی تحریکی نظمیں کہیں۔ لیکن ہمارے جو ETHIEST ہیں وہ ان نظموں کو الگ کر دیتے ہیں۔

ر : نہیں یہ تو ہمارے اُن کے درمیان اختلاف شاعری کی تعریف میں ہے۔ میں جو کہہ رہا تھا- کہ ہندستان میں .....موضوع بھی بدلا۔ استعارے بھی بدلے.....اس کے مفاہیم میں توسیع کی۔ ظاہر ہے کہ سارے ہندستان میں تحریک آزادی چل رہی تھی۔ کچھ خیالات تھے جو سارے ملک میں تیر رہے تھے۔ اور ہر زبان کے شاعر نے ان خیالات کو لیا اور اپنی زبان کے اعتبار سے اس میں اظہار کیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب تک جو زبان تھی ہماری ۳۶ء کی، وہ ۱۴/اگست ۴۷ء تک تو ساتھ آئی۔ ۱۴/اگست کو ہمارے ملک میں ایک زبردست تبدیلی ہوئی۔ وہ آدھی، ادھوری تبدیلی ہی سہی۔ کیسی ہی سہی مگر تبدیلی ہوئی اور وہ یہ کہ ہم غلام تھے- آزاد ہو گئے۔ تو جو زبان شاعری کے لیے ہم نے غلام ہندستان میں بنائی تھی وہ بعینہٖ آزاد ہندستان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی اور اس کے لیے ہمیں شاعری میں ایک نئی زبان کی ضرورت تھی اور میرا خیال یہ ہے کہ اتھل پتھل چل رہی ہے اور ابھی تک ہمارے شعرا زبان بنانے میں گڑھنے میں یا اسے کوئی نئی شکل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ دس بیس برس میں کوئی زبان بن جائے۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ ہمیں ہماری شاعری کے نئے تقاضوں اور نئی ادبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک زبان کی ضرورت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اُس کو اگر آپ دیکھیں اور ہندستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اس میں- میں یہ دیکھ رہا ہوں۔ (کیا معلوم صحیح ہے یا غلط) - کہ پاکستان میں لہجے، زبان یا استعارے کی بنیاد پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ انھیں استعاروں کو جو ۳۶ء سے چلے آ رہے ہیں اور لگ بھگ اسی

زبان کو جو ۳۶ء سے چلی آ رہی تھی استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر ہماری شاعری میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی ہیں۔ اچھی یا بری وہ الگ بات ہے۔ مگر ہمارے شاعر نئے طریقے کی زبان بنانے کی کوشش، نئے استعارے تلاش کرنے کی کوشش اور نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ کوششیں ہمارے یہاں جاری ہیں۔ یہ جو فرق ہے ہندستان اور پاکستان ن کے اسلوب اور لہجے میں یہ فرق کیوں ہے؟

س :میرا خیال یہ ہے کہ فیض کو الگ کر دیجیے۔ کیونکہ وہ ایک طرز ہی الگ ہے۔ لیکن ان کے بعد کے جو شعرا ہیں۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں- پاکستان کے- ان کے لہجے میں ایک غم کی لہر ہے۔ ہمارے ہاں ایک نشاط کی لہر ہے۔ جواب بھی باقی ہے۔ مثلاً یہ کہ وحید اختؔر نے میرؔ کی زمین میں ایک شعر کہا۔ میں یہ شعر اکثر Quote کرتا ہوں۔ اور غزل میں یہ بات اکثر کہی جاتی تھی کہ صاحب! دیکھئے فلاں استاد نے یوں استعمال کیا ہے اور میں نے یوں استعمال کیا ہے۔ تو وحید اختر فخر کے ساتھ سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ ''صاحب میں نے لشکر کا قافیہ میرؔ کے بعد اس طرح استعمال کیا ہے۔'' میرؔ کا مشہور شعر ہے کہ۔

دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جاتا جاتا ہے کہ اس شہر سے لشکر نے نکلا

اس نے کہا۔

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں
تم ہوئی ہے تو اسی شاخ سے لشکر نکلا

ر :واہ..... نیا نکالا ہے۔

س :بالکل نیا صاحب..... اور اس پر اس کو اعتماد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ

ہر پیمبر سے صحیفے کا تقاضا نہ ہوا
حق کا یہ قرض بھی نکلا تو ہمیں پر نکلا

ر :واہ..... واہ۔

س :یہ چیز جو ہے وہ پاکستان کی شاعری میں مفقود ہے۔

ر :اس کی وجہ کیا ہے؟

س :اس کی وجہ وہاں کے حالات ہیں۔ آزادی سے پہلے تو روایت ایک ہی تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے ہاں باوجود تمام باتوں کے، جمہوری مزاج ہے جو پاکستان کے ہاں نہیں مل سکتا۔ اس لیے اُن کے ہاں غم اور احتجاج ہے یہ ابھی تک چل رہا ہے۔ اور ایک اور چیز پاکستان کی شاعری میں در آئی ہے۔ وہ ہے ہجرت۔ وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب جو لوگ اپنے پیٹ کی خاطر کام کی خاطر امریکہ اور دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو مہاجر کہلاتے ہیں۔ تو اس پر سب سے بڑا طنز افتخارؔ عارف نے کیا ہے اور بہت خوب

کیا ہے۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا، ہماری ہجرت کیا

اوراب تو ان کے ہاں یہ تین چیزیں ہیں۔غم کا لہجہ، احتجاج اور ہجرت کا تصور۔ ہمارے ہاں احتجاج بہت ہے۔لیکن غم کے لہجے کے ساتھ نہیں۔اور اکبرت بھی نہیں ہے۔

ر :ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں نا۔لیکن یہ شعرا ہندستان اور پاکستان ہیں کے لڑکے جو اس وقت امریکہ اور کنیڈا میں جا کے بس گئے ہیں اور جو شاعری کر رہے ہیں اور صاحب دیوان شاعر بھی ہو گئے ہیں، اُن کی شاعری اگر آپ پڑھیے تو وہ پاکستان کی شاعری کی زبان سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔

س :ظاہر ہے، کیونکہ وہ پاکستانی ہیں۔اوران کا مسئلہ پاکستان ہی ہے۔آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔تو وہ اس سے آزاد ہو بھی نہیں سکتے۔البتہ اب ان کے ہاں کچھ تازہ کاری بھی آئی ہے۔ایک اچھی شاعرہ ہے عرفانہ عزیز۔آپ نے اس کو پڑھا ہے؟

ر :نہیں۔

س :میں آپ کو عرفانہ کی ایک اچھی نظم سناتا ہوں۔ایک تو وہ فیضؔ سے متاثر ہے، ترقی پسند شعرا سے متاثر ہے۔اس کے بعد اس کے پاس اپنی ایک آواز ہے۔لہجہ ہے اور دانشوری ہے

ر :بہت بڑی بات ہے۔

س :اور یہ جو دانشوری ہے۔ یہ نہ تو ہندستان ابھی قبول کر رہا ہے شاعری میں اور نہ پاکستان۔مثلاً میں اس کا ایک شعر سناتا ہوں، غزل کا شعر۔

کتنے نغموں کو جنم دیتی ہے
ایک غنچے کے چٹکنے کی صدا

ر :واہ۔

س :تو اس وقت پاکستان کی شاعری ذاتی کوائف میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہندستان میں بھی۔ان کیفیات کے ساتھ کہئے تو قبول کرتے ہیں۔اور جہاں دانش وری آئی اور ذاتی سطح سے جہاں ذرا بلند ہوئے، اس کو وہ نا قبول کرتے ہیں۔ایک دوسری شاعرہ ہیں پاکستان کی۔عشرت آفریں۔ پڑھا ہو گا اس کو۔

ر :جی ہاں۔

س :اس کے ہاں بھی صاحب بڑی نئی چیزیں ہیں۔اس کا بیک گراؤنڈ یہ ہے کہ باپ کے ہاں کے سایے سے محروم ہو گئی۔مفلسی میں STRUGGLE کر کے اس نے پورے خاندان کو پالا۔ بڑی بہن.....اس کے بعد چھوٹے بھائی.....وہ ہے اتر و نے

کی رہنے والی ..... گونڈے کی۔ اچھا یہ جتنی ہیں، سب ہندستان کی رہنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سنادوں۔ ہماری ایک بھانجی ہے۔ سلطانہ کی بہن کی بیٹی۔ ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔ وہ پوری طرح وفادار ہیں پاکستان کی۔ اور بڑی اچھی بات ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔ جب آتی ہیں تو یہی کہتی ہیں کہ ''خالو! آپ کے ہاں کیا رکھا ہے۔ بمبئی میں درخت پہ درخت، پتھر پہ پتھر، اینٹ پہ اینٹ۔ ہمارے پنجاب میں تو یوں ہے۔'' ایک دن میں عاجز آ گیا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو بی بی! دنیا کی بہترین چیزیں صرف ہندستان میں ہوئی ہیں یہیں ملتی ہیں۔'' کہنے لگی۔ ایک کا نام بتا دیجیے۔ میں نے کہا۔ ''پاکستان'' -تو یہ بات میں نے جمیل الدین عالی کے لیے بھی کہی کہ یہ بھی ہمارے ہندستان کا ہے۔ مہدی حسن بھی ہمارے ہندستان کا ہے۔ پروین شاکر بھی ہمارے ہندستان کی ہے۔ عشرت آفریں بھی ہمارے ہندستان کی ہے۔ زہرا نگاہ بھی ہمارے ہندستان کی ہے۔ سب یہیں کا مال ہے۔ میڈ اِن انڈیا۔ عشرت آفریں کی غزل ہے۔ جس کے چند شعر مجھے یاد ہیں۔

نمو کے عرفاں سے بے خبر ہوں
میں لالۂ دشتِ بے شجر ہوں

ر :واہ واہ۔ یہ ''دشت بے شجر'' کا جواب نہیں۔

س :اس میں دانشوری بھی ہے۔ اور غزل کی پوری روایت کا احترام بھی ہے۔ اب آگے دو شعر سنئے۔

مجھے اٹھانے کا حق ہے کس کو
میں اپنی تربت پہ نوحہ گر ہوں

ر :بھئی واہ۔

س :پھر اس نے آخری شعر کہا ہے۔

وہ کج کلاہوں کی بستیاں ہیں
مجھے نہ لے چل، میں ننگے سر ہوں
(دوسرے وقفے کے ساتھ)

ر :واہ واہ..... یہ شیعہ ہے کیا؟

س :(مسکراہٹ) ہاں شیعہ ہے۔

ر :جبھی ننگے سر ہوں کا استعمال ہے۔ (مزید مسکراہٹ)

س :تو یہ بڑی اچھی آواز میں ہیں۔ اس وقت، میں عرفان عزیز کی بات کر رہا تھا۔ وہ ان دنوں ایک کتاب لکھ رہی ہے منظوم، اس نے مجھے خط میں لکھا ہے کہ ''دس بارہ نظمیں کہی ہیں۔ اور کہہ رہی ہوں۔ اور یہ دو نظمیں آپ کو بھجوا رہی ہوں۔'' اس نے ایک نظم خاص طور پر مجھے بھیجی ہے۔ نظم بڑی خوبصورت ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ ''نیا گوتم''۔ وہ آزاد شاعری بھی کرتی ہیں اور پابند

.....اس نظم کا ایک ٹکڑا آپ کو سناتا ہوں۔ دیکھیے کتنی خوبصورتی سے وہ ''نیا گوتم'' کا مسیج لے کے چل رہی ہیں۔

(اور پھر جعفری صاحب نے اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ عرفانہ عزیز کی نظم سنائی۔) ع

ذکر اس پری وش، اور پھر بیان تیرا..... نظم واقعی خوبصورت تھی ہم سب ہمہ تن گوش بنے سنتے رہے۔

پھر راہی صاحب نے سکوت توڑا۔

ر :مگر اس میں بھائی! فیضؔ کا اثر تو نہیں ہے۔ اس میں تو آپ کا اثر زیادہ لگتا ہے۔ بلکہ آپ ہی کا اثر لگ رہا ہے۔ گستاخی معاف۔ یہ آپ کچھ انکسار میں کہہ رہے ہیں۔

س :نہیں نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ فیضؔ۔

ر :فیضؔ کی تو پرچھائیں نہیں ہیں کہیں۔

س :میں نے اس نظم کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو مجموعی طور پر...

ر :ہمارے سامنے جو مثال آئے گی ہم تو اسی پر کہیں گے نا..... اچھا میں ایک بڑا بے ہودہ سوال کرنا چاہتا ہوں۔

س : یہ بڑی اچھی بات ہے۔

ر :ہاں تو سوال بہت کہ یہ جو سوشلسٹ سماج میں چین سے لے کر پولینڈ تک جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اچھی یا بری ہیں- اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن کیا ان سوشلسٹ ممالک کے ادیبوں نے اس تبدیلی کی آہٹ سنی تھی؟

س :میں اتفاق سے ان دنوں کچھ مضامین لکھ رہا ہوں اور جو میری ۶۴ء کی کتاب کا نام ہے۔ ''ایک خواب اور'' وہی نام میں نے اسے دیا ہے۔ ''ایک خواب اور'' ادیبوں نے اس کی آہٹ سنی تھی۔ سوویت یونین کے ادیبوں کے ذکر سے میں شروع کروں گا۔ اور اس میں پہلو ونرودا نرودا اور ناظم حکمت کو بھی شامل کروں گا۔

ر :نہیں ان کو آپ شامل مت کیجیے۔ ان پر میں بعد میں بات کروں گا۔ کیونکہ ناظم حکمت ماسکو میں تو تھے- مگر وہ ماسکو کے تو نہیں تھے۔ میں صرف یہ چاہ رہا ہوں کہ وہ شعرا ہو سوشلسٹ سوسائٹی کے تھے۔

س :میں صرف ایک کا ذکر کروں گا۔ جو ادیب بھی ہے۔ شاعر بھی ہے۔ جرنلسٹ بھی ہے اور بہت زیادہ مشہور ہے، ایلیا اہرن برگ میں جب ۱۹۵۴ء میں سوویت یونین گیا تو وہ تھی سوویت ادیبوں کی دوسری کانفرنس۔ ان کی پہلی کانفرنس ۳۴ء میں ہوئی تھی۔ جہاں سے سوشلسٹ ریلزم کا نعرہ بلند ہوا۔ اور ۵۴ء تک، بیس سال تک ادیبوں کی کوئی کانفرنس نہیں ہوئی۔ وہ پورا اسٹالینی دور رہا۔ اس دور میں یہ چیز وہاں پر مان لی گئی تھی کہ سوویت یونین میں اور سوشلسٹ سماج میں منفی کردار نہیں۔ اور اگر ہیں تو وہ باقیات ہیں پرانی سرمایہ داری اور جاگیرداری ہے۔ تو یہ منفی واقعات اور کرداروں کو ادب میں پیش نہیں کیا جانا چاہیے۔ اور سوشلسٹ ریلزم میں یہ اصول بھی شامل تھا۔ کہ ہمیشہ رجائیت سے بھرا ادب ہونا چاہیے جو مستقبل کی نشان دہی کرے۔ اس وقت جب میں پہنچا۔ خواجہ احمد عباس اور بلونت گارگی میرے ساتھ تھے۔ اہرن برگ کے ایک ناول پر بڑا زبردست حملہ ہوا۔ اس کا انگریزی

ترجمہ تھا Hog جو برف کے پگھلنے کو کہتے ہیں۔اس کا اردو ترجمہ ہوگا۔''جب برف پگھلتی ہے''موسم بہار جب آتا ہے تو برف پگھلنا شروع ہوتی ہے۔اس ناول میں اس نے منفی کردار دکھائے ہیں۔اہرن برگ نے کانفرنس میں جو اپنی مدافعت میں تقریر کی۔اور جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے بڑا اہم تھا۔اس سے میں نے بہت روشنی حاصل کی پھر مجھے بعد میں بہت سے تجربے ہوئے۔اس میں اس نے کہا کہ سوویت سماج میں ایک تضاد ہے اور وہ تضاد یہ ہے کہ ایک اچھا شہری برا انسان ہے۔مثلاً یہ کہ ایک بہت بہادر آدمی ہے۔(اس زمانے میں تو ساری باتیں جنگ کے حوالے سے ہوتی تھیں نا)۔جنگ کے زمانے میں اس نے بڑا کام کیا۔اسے تمغے ملے۔اعزازات ملے۔لیکن وہ بیوی بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔دوستوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے تو وہ انسان برا ہے۔لیکن شہری اچھا ہے۔اور لوگ اس شہری کی تعریف کرتے ہیں۔دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جو انسان اچھا ہے مگر شہری بڑا ہے۔مثلا یہ کہ بدقسمتی سے وہ بزدل ہے۔میدان جنگ سے بھاگ آیا ہے وغیرہ یہ مقام وہ ہے جہاں پارٹی کچھ نہیں کرسکتی ۔ یہ ادیبوں کا مقام ہے۔ ان مسائل سے عہدہ برآ ہونا ان کا فرض ہے۔ بہت بڑی بات کہی اس نے۔اسٹالین کو مرے ہوئے سال سوا سال ہوا تھا، دسمبر ۵۴ء میں۔تو اس کو داد بھی ملی۔اس کو داد دینے والوں میں سوویت یونین سے زیادہ باہر کے انقلابی تھے اور اس کا سب سے بڑا طرفدار تھا لوئی آراگاں۔تو وہاں کے ادیب جو تھے انھوں نے اس کا احساس کرلیا تھا کہ انھوں نے کتنی غلطیاں کی ہیں .... تو یہ ساری چیزیں وہاں کے ادیبوں کے سامنے تھیں۔اور وہ ادیب جو ۱۹۳۰ء سے لے کے اسٹالین کی موت تک لڑتے رہے، ان میں سے بہت سے ہیں جو قتل کردیے گئے اور ان کی چیزیں BAN کردی گئیں، اب وہ چیزیں نکل رہی ہیں۔اور سامنے آرہی ہیں۔اور ان کا سکریٹری فدئیف جو خود بہت اچھا ادیب تھا،''نیک گارڈ''اس کا ناول ہے۔ بہت اچھا ناول۔اس نے خودکشی کی خبر وشیف کے دفتر میں۔اس لیے کہ جتنی ادیبوں کو سزا دی جاتی تھی، ان پر دستخط اسی سے کرواتے تھے۔وہ نشے کا عادی ہوگیا تھا۔کیونکہ ضمیر اس کا بیدار تھا اور جو چیزیں پڑھنے کو ملیں ان میں یہ تھا کہ اسٹالین کی نظر روسی ادب پر بہت اچھی تھی۔کلاسیکی ادب کا عاشق بھی تھا اور جانتا بھی تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سوویت یونین میں یعنی روس میں ادیب کا اثر اس کے پڑھنے والوں پر پڑتا ہے۔دستووسکی کا خود عاشق تھا۔ پڑھتا تھا لیکن عوام کے لیے نہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔صرف ایک شخص تھا جو اسٹالین کو کسی حد تک اسٹالین سے باہر کرسکے۔وہ تھا گورکی، جو اس کے برابر بیٹھتا تھا۔اور میں نے یہ پڑھا کہ جب غصے سے اسٹالین کا سانس پھولنے لگتا تھا، تو وہ کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا۔چنانچہ ایک ادیب کا واقعہ یہ ہے کہ اسٹالین - جو سارے MANUSCRIPT خود پڑھتا تھا۔ اس نے ایک MANUSCRIPT پڑھا۔اور ناشتے پر اس ادیب کو بلایا۔وہ کاپیتے ہوئے گیا۔اسٹالین میز کے پیچھے بیٹھتا تھا۔گردن گھما کے نہیں دیکھتا تھا۔صرف نظروں سے کام لیتا تھا۔گورکی اس کے برابر ہوتا تھا۔اس سے اسٹالین نے سوال جواب شروع کیے۔تو ایک موقع پر گورکی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور کہا۔اس ادیب نے سوویت ادب اور ادیبوں کے بارے میں گفتگو کرنے کا حق حاصل کرلیا ہے۔''تو یہ STRUGGLE اُن کی چل رہی تھی۔ایسا نہیں کہ ادیب بے حس تھے وہاں کے اسٹالین کا اقتدار

اتنا بڑھا ہوا تھا کہ۔ایک واقعے کو پہلونرودا نے لکھا ہے کہ.....اہران برگ نے کوئی کتاب لکھی تھی۔اس کی کتاب پر تنقید ہورہی تھی۔ اہرن برگ پر ہمیشہ تنقید ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ فرانس مین رہتا تھا FRENCH CULTURE اور FRENCHLITERATURE کا بڑا عاشق تھا اور AESTHETICS سے بڑا شغف تھا۔سوویت یونین اسے پسند نہیں تھا۔ایک روز صبح کے وقت اس کو ٹیلی فون آیا۔اس کی بیوی نے اٹھایا۔اور گھبرا کر ٹیلی فون رکھ دیا۔اور اس سے کہا کہ کوئی آدمی بات کررہا ہے وہ کہتا ہے کہ ''میں اسٹالین ہوں۔'' اسے یقین نہ آیا۔اس نے ٹیلی فون اٹھایا۔واقعی اسٹالمین تھا۔اس نے کہا۔''میں نے تمہاری کتاب رات کو پڑھی اور واقعی بڑی اچھی کتاب ہے۔'' مبارک باد دی۔ساری تنقید بند ہوگئی ہے،سوویت یونین میں اس کتاب پر اس کی ایک تعریف ہے۔تو ان دونوں کے لئے لڑنا بھی بڑا کام تھا۔

ر :اچھا ایک سوال بس میرا رہ گیا ہے کہ آپ جو ہیں شاعر بھی ہیں،نقاد بھی ہیں۔تو وہ جو علی سردار جعفری نقاد ہے، وہ علی سردار جعفری جو شاعر ہے۔ان کی شاعری اور ان کی شاعری میں خاص طور پر اُن کے لہجے،ان کے اسلوب اور ان کی نظموں کی جو بناوٹ ہے اس کے بارے میں اس نقاد کی کیا رائے ہے۔

س :بہت مشکل سوال ہے۔لیکن میں ایک بات یہ بتادوں کہ میں ہمیشہ، بار بار دیکھتا رہا ہوں، کہتا رہا ہوں پھر کہہ رہا ہوں کہ میں نقاد نہیں ہوں۔اس لیے کہ نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے اور خاص طور سے- یورپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔وہ میری طبیعت میں نہیں ہے۔میں نے پرانے شعرا کا جائزہ لیا۔اس میں غالبؔ اور میرؔ کے علاوہ تکبیر بھی ہیں۔میرا بھائی بھی ہے۔رومی بھی ہیں، حافظؔ شیرازی بھی ہیں۔میں نے بار بار لکھا کہ میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ میں اپنی شاعری کے لیے معیار بنا سکوں۔ تلاش کرسکوں اپنی شاعری کی تربیت کے لیے۔

(میں نے دل میں سوچا کہ 'اقبال شناسی' کو آپ کس زمرے میں رکھیں گے؟)

کیا محض جائزہ؟ اور اگر جائزہ تو کیا تنقیدی جائزہ نہیں؟ مگر اس وقت خاموشی شرط تھی، اور دو دانشوروں کی گفتگو میں مداخلت بد تمیزی کی دلیل بھی۔گفتگو جاری رہی۔(رش ع)

تو اس میں یہ ہے کہ میں اپنی شاعری کے بارے میں صحیح رائے تو نہیں دے سکتا۔

ر :بھئی آپ یہ سمجھے کہ یہ شاعری میں نے کی ہے۔

س :اس کے بعد بھی یہ بات بڑی ذاتی ہوجاتی ہے۔بات یہ ہے کہ میری شاعری کے کچھ حصے جو خراب ہیں اور میں جواب اس وقت اپنی ایک کتاب EDIT کررہا ہوں کلیات کی شکل میں اس میں سے میں اُن کو کاٹ رہا ہوں۔ممکن ہے کہ بعض غلط چیزیں کٹ جاتیں۔اور کچھ ایسے ہیں جو اتنے نئے ہیں جنھیں ہمارے لوگوں کو قبول کرنے میں دشواری ہے۔لیکن اس کی داد مجھے ایسے بعض حلقوں سے ملی کہ مجھے اپنی شاعری پر یقین آ گیا، بلکہ یقین مستحکم ہوگیا۔مثلاً یہ کہ جعفر علی خان اثرؔ اگر میری کتاب ''نئی دنیا کو سلام'' کی داد دیتے ہیں تو پھر میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ کون اس کی برائی کررہا ہے۔اسی طرح میری نظم ''پتھر کی دیوار'' جب آئی

۱۹۵۳ء میں۔تو اس پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔صرف ایک تبصرہ آیا اور وہ مسعود حسین خاں کا تھا۔جس میں انھوں نے یہ کہا، ریڈیو پر کہ یہ شاعری نہیں ہے۔اس میں صرف ایک نظم ہے جو قابل برداشت ہے۔لیکن مجھے جو تجربہ ہوا وہ بالکل اس سے برعکس تھا۔ میں ۵۴ء میں دلی میں جامع مسجد کے اردو بازار میں ایک دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔مولوی سمیع اللہ بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے مجھ سے کہا کہ ''اینگلو عربک کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔آپ بھی چلئے۔'' میں نے کہا میرا پرانا کالج ہے میرے پاس دعوت تو نہیں ہے، چلو چلتے ہیں۔'' وہاں جو میں گیا۔میں نے یہ دیکھا کہ اس کی صدارت خواجہ غلام السیدین کر رہے ہیں اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ سامعین میں ہیں۔معلوم یہ بھی ہوا کہ انھوں نے چند مخصوص شعرا کو دعوت دی ہے۔اور ان سے یہ بھی کہا ہے کہ'' آپ اپنے کلام کے بارے میں کچھ کہیے اور اپنی بہترین نظم سنایئے۔'' چنانچہ میں نے وہاں ''پتھر کی دیوار'' سنائی بہت مقبول ہوئی اور ڈاکٹر عابد حسین نے یہ کہا کہ ترقی پسند شاعری جوان ہوگئی ہے۔اس داد کے بعد میری نظم جامعہ اور علی گڑھ کے لیے بھی قابل قبول ہوگئی۔لیکن نقادوں کے حلقوں میں نہیں۔اس کے بعد اسی کالج میں دس بارہ دن کے بعد ایک اور مشاعرہ ہوا۔اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔اور مخدوم محی الدین بھی تھے۔وہاں میں نے یہ نظم پھر سنائی مولانا آزاد کا ذوق بڑا کلاسیکی تھا۔انھوں نے مشاعرے کے بعد مجھ سے اور مخدوم سے یہ کہا کہ آپ مجھ سے ملنے آیئے۔وقت فوراً دے دیا۔ہم ان کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔بہت دیر باتیں کرتے رہے۔شاعری پر انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔لیکن انھوں نے بلایا تو شعر سننے ہی کے لیے تھا۔پھر انھوں نے کہا کہ..... ''میرے بھائی! میں بھی کمیونسٹ تھا اور اب بھی ہوں۔لیکن تشدد کے دائرے سے باہر۔'' میں نے اس کو بھی اپنی شاعری کے لیے داد سمجھا۔'پتھر کی دیوار' کے ضمن میں۔اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں کراچی میں ایک واقعہ ہوا۔ میں جس کتاب کا نیا اڈیشن نکال رہا ہوں اس میں یہ دیباچہ ہے کہ عشرت آفریں نے مجھے ایک لڑکی سے ملایا تو اس نے مجھ سے کہا کہ'' آپ میرے یہاں کل کھانا کھانے آیئے۔'' میں خاموش ہوگیا۔میں نے سبطِ حسن سے پوچھا کہ'' بھی تم جانتے ہو کون ہے؟'' اس نے کہا ''نہیں۔ٹھیک ہے۔چلو.....'' وہاں جو گیا تو اس کے والد وہ لڑکی (ان کی تصویریں بھی میرے پاس ہیں) اور جتنے لوگ وہاں جمع تھے، ان میں اکثریت اینگلو عربک کالج کے طلبہ کی تھی۔

ر :اے ہے۔

س :اور وہاں صرف میں شعر سنانے والا۔وہ شعر سنتے رہے۔پھر فرمائش ہوئی کہ ''پتھر کی دیوار'' سنایئے۔میں نے کہا، مجھے پوری یاد نہیں۔اگر میں کہیں رک جاؤں، بھول جاؤں تو مجھے معاف کیجیے۔ان میں سے ایک صاحب نے جیب میں سے ایک کتاب نکالی۔''پتھر کی دیوار''۔میں نے کہا۔'' یہ آپ کو کہاں سے ملی۔'' کہنے لگے۔'' یہ زیروکس کاپی ہے۔اور یہ مجھے تقریری مقابلے میں انعام کے طور پر ملی تھی۔''

اس کے بعد ایک اور واقعہ..... لاہور میں فیضؔ کا جشن تھا۔یہاں سے ہم، مجروح اور کیفی گئے تھے۔سب سے آخر میں میری باری آئی۔جیسے ہی میں کھڑا ہوا آوازیں آئیں۔'' پتھر کی دیوار''..... ''پتھر کی دیوار''..... میں وہاں بھی یہ کہا کہ ''میں بھول

رہا ہوں معاف کیجئے۔'' کہنے لگے۔معاف نہیں کریں گے۔آپ سنایئے تو.....''

ر :ہم بتلائیں گے۔

س :جی ہاں.....یہی ہوا۔صاحب میں جہاں رکتا تھا، وہ مصرع دیتے تھے۔

ر :تو اصلی قبولیت اسی کو تو کہتے ہیں۔جب میں نے نقار کہا تھا تو پیشہ ور نقاد کی بات نہیں کر رہا تھا۔دراصل ہر شاعر میں ایک نقاد تو ہوتا ہی ہے۔

س :تو میری بھی ان چیزوں پر نظر ہے۔ایک اور چیز ہے۔اب جو یہ ''اودھ کی خاک حسیں'' ہے۔

اس نظم کی تعریف ایک ایسے شخص نے کی جس کو میں نہیں جانتا۔جس نے میری ساری شاعری یہ کہہ کے رد کر دی کہ ''اس میں کمیونزم کے متعلق کچھ ہے وہ تو بے کار ہے۔لیکن یہ نظم جو ہے والٹ وِٹ مین اور کالی داس کی یاد دلاتی ہے۔'' یہ حمد صادق ہے۔ HISTORY OF URDU LITERATURE کے مصنف، اب اس میں جو بحر میں نے استعمال کی ہے وہ بحر آج کی آزاد شاعری کی سب سے مترنم بحر ہے۔

ر :جو ''پتھر کی دیوار'' میں ہے۔

س :نہیں، ''پتھر کی دیوار'' کی عمر ذرا سی اجنبی ہے۔''ایشیا جاگ اٹھا'' میں یہی بحر ہے۔اور دیکھیے ''ایشیا جاگ اٹھا'' کو کہاں سے انعام ملا؟ ملیالم زبان سے۔کمار آشن سوسائٹی نے مجھے اس پر ایوارڈ دیا۔اور اس کا ترجمہ بھی ملیالم زبان میں کیا۔ابھی پچھلے سال نہرو صدی کے سلسلے میں ساہیتہ اکادمی نے ہر زبان کے ایک ایک شاعر کو بلایا تو میں نے اپنی دو نظمیں پڑھیں۔''میرا سفر'' اور ''ہاتھوں کا ترانہ''۔''ہاتھوں کا ترانہ'' کے لیے مجھے بنارس یونی ورسٹی کے ہندی کے پروفیسر نے کہا کہ میں اس کا ترجمہ کروں گا۔ اس میں VEDIC THOUGHT کا REFLECTION ہے۔'' میں نے کہا ''یہ ہمارا HERITAGE ہے۔ کیسے آیا مجھے خبر نہیں۔یہ ہمارا حق ہے۔بات یہ ہے کہ جو EARTHDOWN THE چیزیں ہیں جو اس میں آ گئی ہیں، کامیابی کے ساتھ، یہ ہمارا حصہ ہے۔اور میں اس سے مطمئن ہوں کہ ہماری شاعری کا سارا مزاج غزل آشنا مزاج ہے۔اور جو شاعر یہ کہتا ہے کہ میری شاعری میں نہ جام و مینا ہے، نہ ساقی ہے اور اس کے بعد یہ کہتا ہو کہ

یہ سیدھے سارے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں

تو اس کی داد محمد صادق سے ملتی ہے۔

ر :اب جو یہ غزل آشنائی کی بات نکلی، وہ بڑی اچھی ہے۔میں دوسری طرف چل رہا ہوں کہ اقبال کا فارسی کلام تو میں نے اتنا جی لگا کے نہیں پڑھا ہے لیکن اردو کلام جوان کا پڑھا تو مجھ کو جہاں تک نظموں کے ڈھانچے کا سوال ہے۔اور جس طرح سے وہ نظموں

کو DEVELOP کرتے ہیں، STRUCTURE وہ مجھ کو بہت ناقص لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی جو آواز ہے اور ان کی آواز کی جو مٹھاس ہے، رچاؤ ہے اور عظمت ہے وہ پکڑ لیتی ہے۔ تو مجھ کو لگتا ہے ان کا اسلوب غزل کا ہے جس کو انھوں نے نظموں میں استعمال کیا۔

س : جہاں غزلوں میں انھوں نے اس اسلوب کو چھوڑا ہے۔ اس کو لوگ قبول نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ غزل کے لیے ایک نیا راستہ تھا۔ مثلاً ''شمع اور شاعر'' کے یہ اشعار

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح تک کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اس میں STRUCTURE کے بارے میں ایک چیز کہوں مجھے نہیں معلوم کہ یہ چیز تمہارے ذہن میں ہے یا نہیں۔ وہ یہ کہ ..... جوشؔ کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اور جوشؔ پر یہ اعتراض بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ یہی بات اقبال کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے کہ خیال کا ارتقا نہیں ہے اور ایک ہی بات میں استعاروں میں کہتے چلے جا رہے ہیں۔ اقبالؔ کی ''شمع و شاعر'' کے کئی بند ہیں جس میں چار پانچ شعر ایک ہی خیال کو مختلف استعاروں میں بیان کر رہے ہیں کہ۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح تک کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بزم مے سے وہ پرا پنے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

ر : ہاں تو..... یہ کیوں ہے؟

س : یہ استادی کا اصل رنگ ہے۔ اور یہ اس زمانے میں بڑا مقبول تھا۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کلاسیکی استاد ہوتا ہے تاکہ ایک بول کو لے کے تین تین گھنٹے گا رہا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ہیں جو اسے قابل گرفت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز قابل گرفت نہیں ہے۔ یہاں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے لہٰذا میں نام لے لوں۔ مثلاً اختر الایمان کہ ''صاحب اس میں نظم کا ارتقا نہیں ہے''۔ میری نظر میں اور تقائے خیال ہے۔

ر : ارتقا تو ہے مگر نظم نہیں ہے۔

س : نظم نہیں..... وہاں غزل کا رنگ ہے۔

ر : نہیں میں اقبالؔ کی نہیں اختر الایمان کی بات کر رہا ہوں- کہ ارتقا تو ہے مگر نظم نہیں ہے۔

س : میں اسے دوسری طرح ذرا نرم الفاظ میں کہوں گا کہ اقبال کی آواز کا اثر ان کی آواز سے زیادہ ہے۔ بہت زیادہ ہے۔ اب یہ دیکھیے۔ جوشؔ نے کیا عمدہ نظم کہی ہے۔

ع مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب

اس میں جو آخری شعر ہے۔

جوشؔ کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا وہ مردِ نا مسلماں ہے تو کیا

اس میں صاحب جو ایک یلغار ہے تشبیہوں کی استعاروں کی۔ حد ہے!

ر :وہ تو ان کا اسٹائل ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض کرے تو۔ یہ تو بے وقوفی کی بات ہے۔

س: چل چکی ہے آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج اگر راون کا گھر سیتا کا زنداں ہے تو کیا
بن چکا ہے مرمر و سیلاب خون ہاشمی
آج ابوسفیان کے گھر میں چراغاں ہے تو کیا

کہاں سیتا اور کہاں ابوسفیان..... یہ سب آ گئے۔

ر :اچھا ایک آخری سوال..... کہ یہ جو ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک جو بھی اردو میں ادب .....اچھا یا برا..... پیدا ہوا، اس کے بارے میں مجموعی طور پر آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ مطمئن ہیں؟

س :مجموعی طور پر تو ہم مطمئن ہیں۔ لیکن اصلی جائزہ تو پچاس برس کے بعد لیا جائے گا۔

ر :آپ سے میں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر تو بغیر پڑھے لکھے لوگ.....

س : راہی اس زمانے میں میں نے ایک کام ایسا کیا کہ ڈاکومنٹری فلم بنائی۔ انگریزی میں THE LITERARY STORM کے نام سے۔ اس میں چورہ زبان کا STRUGGLE FREEDOM ROLE OF LITERATURE IN شامل ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ہم نے شروع کیا ۱۹۴۷ء تک۔ اس میں غالبؔ بھی ہیں۔ حالی بھی شامل ہیں۔ شبلی بھی ہیں، اقبال بھی ہیں۔ حسرت، جوشؔ، ارنی، ولا چھول اور ٹیگور بھی ہیں۔ تو صاحب ہمیں تو ایسا لگا کہ ہماری شاعری کو ہمارے اپنے نقاد زیادہ کم تر کہہ رہے ہیں۔ جب کہ۔

ر :ہماری شاعری بڑی اچھی ہے۔

س :بڑی اچھی ہے اور بہت بلند ہے۔ میں اس کی داد بھی دوں گا۔ تو بھئی ہم تو اپنے ادب سے مطمئن ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اصناف جو ہیں کسی زبان میں ایک صنف ترقی کرتی ہے کسی میں دوسری۔ کیونکہ کلچر کی جو فضا ہوتی ہے، وہ اس کے لیے ہموار نہیں ہوتی۔ شاعری میں انگلستان کو جو درجہ حاصل ہے وہ یورپ کی کسی زبان کو حاصل نہیں۔ جو درجہ ناول میں روس کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں۔ موسیقی میں جو درجہ جرمنی کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ اسی طرح جو مقام اردو شاعری کو حاصل ہے وہ کسی زبان کی

شاعری کو حاصل نہیں۔ ناول میں ہم ان سے پیچھے ہیں۔ افسانے میں ہم بہت ترقی کر گئے تھے مگر اب جو یہ زوال آیا ہے۔ تو یہ آیا نہیں لایا گیا ہے۔

ر : کبھی کبھی مجھ کو یہ سوال پریشان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی اردو شاعری فارسی سے بہت متاثر رہی۔ فارسی سے اردو کو ملی رباعی، قصیدہ، مثنوی اور غزل۔ یہ چار بڑی اصناف ہم کو فارسی سے ملیں اور ہندستان میں بہت اچھی مثنویاں بھی لکھی گئیں اردو میں دکنی میں بہت عمدہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ اس گئیں۔ اچھے قصیدے بھی لکھے گئے لیکن غزل کی مقبولیت کا کیا راز ہے؟

س : یہ بتانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ جڑا ہوا سوال یہ ہے کہ جس سرزمین سے یہ آئی ہے، وہاں مقبول نہیں ہے۔ ایران میں۔

ر : مجھ کو ذاتی طور پر یہ لگتا ہے کہ غزل جو ہے فارسی میں جب شروع ہوئی تو وہ مسلسل نظم تھی۔ کیونکہ قصیدے کی تشبیہ کو انہوں نے قصیدے سے الگ کیا۔ تو غزل میں تسلسل INHERENT ہونا چاہئے۔

س : حافظؔ کی ساری غزلوں میں نہیں ہے۔

ر : میں بھی کہہ رہا تھا۔ حافظؔ کے زمانے میں دارالتراجم کھل گئے تھے ہندستان سے بڑے پیمانے پر لین دین اور تجارت ہو رہی تھی۔ ہندستان میں ایک ایسی صنفِ شعر ہے جو خیال کی پابند نہیں ہے۔ جو صرف ایک فارم ہے۔ جس کو ہم ''دوہا'' کہتے ہیں۔

س : یہ بات میرے ذہن میں تھی۔ میں خود یہ کہنے والا تھا۔ بھئی ہماری، ہندستان کی روایت جو ہے وہ ORAL ہے۔ اور دوہا جو ہے وہ مصرعوں میں ایک پورا خیال دے دیتا ہے۔

ر : اور کسی خیال کا پابند نہیں۔ اس میں آپ کوئی خیال بھی باندھ دیجیے۔ جب یہ دوہا، وہاں ایران میں پہنچا۔ تو ایرانی شاعروں نے کہا کہ ''بھائی یہ تو بڑے کمال کی چیز ہے'' اور مجھ کو لگتا ہے کہ اس کے بعد فارسی غزل کا جو ارتقا ہوا تو اس کے اندر یہ تبدیلی آئی کہ اب الگ الگ شعر ہونے لگے، غزل، غزل نہیں رہ گئی بلکہ الگ الگ شعر والی ایک صنف۔ کہیں زندگی کا شعر ہے۔ کہیں موت کا ہے۔ کہیں بہار کا شعر ہے، کہیں خزاں کا۔ اس طرح ہمارے پاس دو طرح کی چیزیں آئیں۔ ایک تو غزل تھی۔ اور دوسری وہ جس کو ہم لوگوں نے ریختہ کہا۔ ریختہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ بہت گھپلے کیے ہیں ہمارے بزرگوں نے۔ لیکن غالبؔ نے یہ کہا کہ ع ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ..... تو ریختہ سے مطلب زبان نہیں لگتا۔ کیونکہ..... کیا ہے..... کہ قائم چاند پوری کا جو شعر ہے ؎

قائم میں غزل طور کہا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

تو اس کے معنی کیا ہیں؟ کہ غزل ہی کی طرح ریختہ ایک صنف سخن ہے، ریختہ زبان نہیں ہے۔ اور جب غالبؔ یہ کہہ رہا ہے کہ ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو ..... تو وہ صنف سخن کی بات کر رہا ہے۔ غزل تو میرے خیال میں ایک صنف ہے جو مسلسل ہوتی

ہے۔ ریختہ ایک صنف ہے جو مسلسل نہیں ہے، آپ استادوں کی غزل پڑھیے تو لگتا ہے کہ یہاں سے یہاں تک ایک تسلسل آ رہا ہے۔ ارتقائے خیال ہے۔ اور باقی اشعار پھٹکل نہیں۔

س : بھئی ہم ریختہ پر بات کرنے کی بجائے اس بنیادی سوال پر بات کریں۔ کیونکہ میرے لیے یہ خیال نیا ہے کہ فارسی میں غزل مسلسل تھی اور جب دوہا ایران پہنچا تو پھٹکل اشعار کی شکل ہونے لگی۔ تحقیق کا مسئلہ ہے۔ میری نظر میں نہیں ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل جو ہے..... میں اس کے اسباب بیان نہیں کر سکتا کہ ایران میں اس کا زوال کیوں ہوا اور ہندوستان میں اس کا عروج کیوں ہوا۔ البتہ اس کا میرے پاس ایک EXPLANATION ہے۔ سوشل اور پولیٹیکل۔ غزل سب سے زیادہ نیچرل فارم ہے شاعری کا۔ مثلاً ہم یہاں گھر میں بیٹھے ہیں۔ کتابیں ہیں، پنکھا چل رہا ہے۔ آپ لوگ یا باتیں کر رہے ہیں۔ باہر نکلے۔ منظر بدل گیا۔ وہاں ہمیں ایک لفٹ مین ملا۔ نیچے اُترے تو پھر منظر بدل گیا۔ آگے چلے تو ایک جنازہ مل گیا۔ اور آگے چلے ایک برات مل گئی۔ جب گھر پہنچے تو یہ نہیں محسوس ہوتا کہ گھر سے گھر تک ان منظروں میں جھٹکوں میں ہم نے کیا کیا دیکھ لیا۔ یہی بات غزل میں ہے لیکن اچھے شاعر کے ہاں دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک تو اس کا مجموعی تاثر اور ایک آہنگ۔ یہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ متفرق شعر کے ساتھ آہنگ بدل گیا یا اس کا تاثر بدل گیا۔

ر : بھائی میں ایسا کروں کہ غالبؔ کی دس بارہ غزلوں کو لے کر اور ان کو ARRANGE کر کے بتا دوں کہ یہ دیکھئے ایک ہی خیال چلا جا رہا ہے۔

س : ہیں ایسی غزلیں۔

ر : میں نے زیادہ تر غزلوں میں یہی دیکھا ہے کہ ایک خیال چلا جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے۔ اگر آپ ان غزلوں کو نئے سرے سے ترتیب دیجیے (ضروری نہیں کہ وہ پہلا شعر ہو، مقطع بھی ہو سکتا ہے) لگتا ہے یہ خیال کا ارتقا ہے جو چل رہا ہے۔ آخر میں آ کے دو شعر بچ جاتے ہیں۔ اس میں وہ خیال نہیں آتا۔

س : جیسے غالبؔ کی ایک غزل ہے کہ ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔ آخر میں بالکل الگ شعر ہے۔ ع بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفان کیے ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ میرے لیے خیال کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ یہ موضوع ہے ہجر کا، لیکن اس نے بیان کیا ہے اس وصال کی نشاط کے ساتھ۔

ر : تو اس طرح سے اگر ہم لوگ از سرِ نو اپنی غزل کو پڑھنا شروع کریں تو ایسا نہیں لگتا آپ کو ..... کہ ہمیں ایک نئی چیز ملے گی۔

س : ضرور ملے گی۔

ر : نیا دروازہ کھلے گا۔ کچھ نئی ہوا شاید آئے۔

س : دراصل ہمارے یہاں غزل کو بونئی زندگی ملی ہے وہ ہمارے یہاں کے سیاسی حالات کے ساتھ ہوا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے غزل کی مقبولیت نہیں تھی۔ خود فیضؔ جن کی غزلیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور جن کے ذریعے سے پھر اور غزلیں

بھی آئیں ان کی بڑی اچھی غزلیں موجود تھیں جواب گائی جارہی ہیں۔تقسیم کے بعد پاکستان میں یہ ہوا کہ یہ جو پکی موسیقی ہے، کلاسیکی- چونکہ اس کا مزاج سہو ہے، وہ غیر مقبول قرار پائی۔ ع موری بہنیاں نہ مروڑ کرشن مراری.....تو ہماری کلاسیکی موسیقی تو کرشن اور رادھا کی روایت سے ملی ہوئی ہے۔تو یوں کلاسیکی موسیقی نا مقبول ہوئی۔حالانکہ وہاں جانتے ہیں لوگ اور سیکھتے ہوئے بھی ہیں۔تصوف کی روایت موجود تھی۔اس لیے وہاں کے خوش گلو گائیکوں نے غزل گائیکی شروع کی۔ہندستان میں اردو میں پتا پڑی تھی اس لیے جو اُردو والا تھا وہ یہاں خوش نہیں تھا۔ اور جو پنجاب سے ہندو اور سکھ آیا تھا۔ ان کا یہ NOSTALGIA تھا۔انھوں نے اس کو اٹھالیا۔اور جو چیز سامنے آئی تو صاحب اس کا ایک پوشیدہ حسن تھا جو کسی وجہ سے زمانے کی خاک میں دبا ہوا تھا، آج وہ ظاہر ہورہا ہے۔لیکن اس سے خرابی جو پیدا ہورہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ایک بہت بڑا حصہ تفریح کا سامان بن گیا ہے۔اور نئے نئے گانے والے شاعروں کو ملازم رکھ رہے ہیں۔دس الفاظ دے رہے کہ صاحب 'جام' کا لفظ آجائے۔شراب کا لفظ آجائے اور 'زلف' کا لفظ آجائے تو یہ جو ہے اس سے نقصان پہنچا۔لیکن ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔یہ اس کا دوسرا پہلو ہے۔مقبولیت اپنی جگہ ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بغیر کسی COMMENT کے ضمیر جعفری کا میں ایک شعر سنادوں۔

دریدہ دامنوں، خستاں گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں، مسلمانوں کی باتیں ہیں

(قہقہہ.....اور اسی کے ساتھ یہ دلکش محفل برخاست ہوگئی۔) راہی صاحب نے اپنے پان سمیٹے۔اور جعفری صاحب نے اپنی عینک اتاری۔سلطانہ بھابی کھانے کا انتظام کرنے پہنچی۔راہی صاحب نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ گھر پہ بھائی صاحب (مونس رضا) تشریف فرما ہیں۔مگر رباب آپا، ستارہ آیا اور سلطانہ بھابی نے ناچیز کو روک لیا۔کھانے کی میز پر میں پھر.....جعفری صاحب محو گفتگو تھے۔)

سچ ہی تو ہے۔ گفتگو بند نہ ہو.....بات سے بات چلے